آیاتھا 7	1 سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ 5	رکوعھا 1

بِسْمِ اللّٰهِ	الرَّحْمٰنِ	الرَّحِيْمِ
اللہ کے نام سے (شروع کرتا ہوں)	جو نہایت مہربان	بہت رحم کرنے والا ہے

اَلْحَمْدُ	لِلّٰهِ	رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿1﴾	الرَّحْمٰنِ	الرَّحِيْمِ ﴿2﴾
ہر قسم کی تعریف	اللہ کے لیے	(جو) تمام جہانوں کا رب ہے	نہایت مہربان	بہت رحم کرنیوالا ہے

مٰلِكِ	يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿3﴾	اِيَّاكَ	نَعْبُدُ	وَ	اِيَّاكَ
مالک ہے	بدلے کے دن کا	صرف تیری ہی	ہم عبادت کرتے ہیں	اور	صرف تجھ سے ہی

نَسْتَعِيْنُ ﴿4﴾	اِهْدِنَا	الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿5﴾	صِرَاطَ الَّذِيْنَ
ہم مدد مانگتے ہیں	ہمیں ہدایت دے	سیدھے راستے کی	راستہ ان لوگوں کا جو

اَنْعَمْتَ	عَلَيْهِمْ	غَيْرِ	الْمَغْضُوْبِ	عَلَيْهِمْ	وَ لَا	الضَّآلِّيْنَ ﴿7﴾
تو نے انعام کیا	ان پر	نہ	غضب کیا گیا	ان پر	اور نہ	(وہ) سب گمراہ ہوئے

وجہ تسمیہ: اس کے مضمون کی مناسبت سے اسے فاتحہ کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ اس سے قرآن کریم کی ابتداء ہوتی ہے، اور اس لیے کہ یہ وہ پہلی سورت ہے جو مکمل نازل ہوئی.

اس کے دوسرے نام: (1) (السَّبْعُ الْمَثَانِيْ) جیسا کہ ارشادِ باری تعالی ہے: (وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعاً مِنَ الْمَثَانِيّ وَالْقُرْآنَ الْعَظِيْمِ) (2) (أُمُّ الْقُرْآن) (3) (أمُّ الكتاب) جیسا کہ حدیث میں ہے: (لاَ صَلاةَ لِمَن لَّمْ يَقْرَأ بِأُمِّ الْكِتَاب)، اور مزید یہ کہ یہ سورت توحید، احکام، جزاء، اور لوگوں کے مختلف طریقوں پر مشتمل ہے، اس لیے بھی اسے ام الکتاب کہا گیا ہے. (4) (الصلاة) جیسے حدیث قدسی میں ہے (قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي ...) (5) (الرُّقْيَة) جیسے حدیث ابی سعید الخدری میں ہے: (وَمَا يُدْرِيْكَ أَنَّهَا رُقْيَة) (6) (الوافِيَة) (7) (الكَافِيَة) کیونکہ یہ سورت ہر چیز کے لیے کافی ہے جبکہ دوسری سورتیں اس کے قائم مقام نہیں ہو سکتیں .

اہمیت وفضیلت: جو سورت ایک دن میں (30) مرتبہ سے زیادہ فرضوں اور سنتوں میں دہرائی جاتی ہو، اور اس کے بغیر کوئی نماز بھی قبول نہ ہوتی ہو، اور اللہ رب العزت کی صفاتِ کمال وجلال پر مشتمل ہو، اور راہِ ہدایت پانے کا سرچشمہ ہو، ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس سورت کے معانی و تفسیر معلوم کرے، صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا: (جس نے فرض و نفل کی ہر رکعت میں فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہیں ہے)، اور إمام الدار قطنی کی صحیح حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (لاَ تُجْزِئُ صَلاَةٌ لاَ يَقْرَأُ

الرَّجُلُ فِيْهَا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ) یعنی جس نماز میں کوئی شخص سورت فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوگی. صحیح بخاری میں ابو سعید بن معلیٰ کی حدیث : (لأُعَلِّمَکَ أَعَظَمَ سُوْرَةٍ فِی الْقُرْآنِ قَبْلَ أَنْ تَخْرُجَ مِنَ الْمَسْجِدِ) میں تمہیں مسجد سے نکلنے سے قبل قرآن کی سب سے عظیم سورت سکھاؤں گا, اور پھر آپ نے انہیں سورت فاتحہ سکھائی, اس جیسی حدیث ابی بن کعب سے بھی مروی ہے ، .مزید آپ ﷺ نے اس سورت کے بارے فرمایا: یہ ایسی سورت ہے جس جیسی تورات انجیل زبور اور قرآن میں نازل نہیں ہوئی .اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے جبریل علیہ السلام نے آپ کو فرمایا: آپ کو دو ایسے نور دیے گئے ہیں جو آپ سے قبل کسی نبی کو نہیں ملے : سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ کی آخری آیات . .

مضمون اور بنیادی مقصد: اللہ تعالی نے ہمیں اس سورت میں ایک عظیم دعاء سکھائی ہے, اور وہ دعاء راہِ ہدایت پانے کی ہے, جس میں انسان کی دنیاوآخرت کی فلاح وکامیابی ہے, اور قرآن کی ابتداء میں یہ دعاء مانگنے کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالی نے ہدایت کے سوال پر مکمل قرآن سامنے رکھ دیا کہ یہ وہ قرآن ہے جس سے تمہیں ہدایت مل سکتی ہے (ذَلِکَ الْكِتَابُ لاَ رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ).

آیات کي تفسير :

(بِسْمِ اللهِ الرَّحْمنِ الرَّحِيْمِ). بسم اللہ فاتحہ کی آیت ہونے میں علماء کا اختلاف ہے, احتیاط کا تقاضہ ہے کہ اسے نماز میں سورۃ فاتحہ سے قبل پڑھنا چاہیے، . بسم اللہ کی فضیلت یہ ہے جس کام میں بسم اللہ پڑھی جائے اس میں اللہ کی مدد شامل ہوتی اور خیر وبرکت پیدا ہوتی ہے .اور شیطان کی شر انگیزیوں سے محفوظ ہوا جاتا ہے. جن موقعوں پر بسم اللہ پڑھنا ضروری ہے اس میں جانور ذبح کرتے وقت، وضوء کی ابتداء میں، کھانا کھاتے ہوئے, اور ہمبستری کے وقت.

(الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ). دعاء کی ابتداء اس ہستی کی تعریف سے کی جارہی ہے جس سے دعاء مانگنا چاہتے ہیں, اور حقیقت میں وہی ذات ہر طرح کی دعاؤں کی مستحق ہے, جسے کچھ بھی عطا کرنے سے کوئی منع کرنے والا نہیں, اور نہ ہی اس کے خزانوں میں کسی طرح کی کمی پیدا ہوتی ہے, اور تعریف صرف اللہ ہی کے لیے ہے, کیونکہ کائنات میں جس شکل وصورت میں بھی کوئی خوبصورتی یا کمال ہے تو اس کا سرچشمہ اللہ ہی کی ذات ہے. رب کا لفظ : مالک وآقا, پرورش کرنے اور حاکم ومدبر و منظّم کے لیے استعمال ہوتا ہے. اور یہ سب معانی اللہ کے لائق ہیں. (الحمد للہ) کی فضیلت میں صحیح مسلم کی حدیث ہے: (وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلأُ الْمِيْزَانَ) کہ وہ کلمہ ہے جو نیکیوں کا ترازو بھر دیتا ہے

(الرَّحْمنِ الرَّحِيْمِ). رحمٰن ورحیم دونوں کا مصدر : رحمت ہے, لیکن رحمٰن کی وہ رحمت جو ہر کافر ومؤمن کے لیے عام ہے, جبکہ رحیم کی وہ رحمت جو صرف اہلِ ایمان کے لیے ہے. اس آیت میں اللہ رب العزت کی عظیم رحمت کا بیان ہے .اسی لیے اسکی رحمت کو اس مبالغہ کے انداز سے بیان کیا گیا ہے.

(مَالِکِ يَوْمِ الدِّيِنِ). دین کے معانی معاملہ, جزاء وسزا, کہا جاتا ہے: (كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ) (جیسا کروگے ویسا بھروگے), قیامت کے دن کا مالک قرار دینے کا مقصد یہ کہ اس دن تمام ملکیتیں ختم ہو جائیں گی, (لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ) آج کے دن کس کی ملکیتیں ہیں؟ صرف ایک ہی غالب و قاہر اللہ کی ذات کے لیے. وہی پورے اقتدار کا مالک ہوگا, نہ اس کی سزا میں کوئی رکاوٹ بن سکے گا, اور

اس کی جزا میں کوئی مانع ہوگا۔ اور یہ وہ دن ہے جس میں تمام اگلی پچھلی نسلوں کا حساب لیا جائے گا، جس سے یہ آیت مبارکہ تلاوت کرنے والے کو اس دن کی تیاری کے لیے ہوشیار اور متنبہ کیا جارہا ہے۔

(إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ) بعض علماء کا فرمان ہے: سورۃ فاتحہ قرآن کا خلاصہ، اور یہ آیت سورۃ فاتحہ کا خلاصہ ہے۔ لفظ عبادت کے مفہوم میں: پوجا و پرستش، اطاعت و فرمانبرداری، بندگی و غلامی، اور ہر وہ قول و عمل شامل ہے جو نیکی و ثواب و رضاء الٰہی کے مقصد سے کیا جاتا ہو، اور ان سب چیزوں کا صرف اللہ تعالیٰ ہی لائق ہے۔ چنانچہ ایسے اعمال صرف اللہ ہی کے لیے ہونے چاہیے۔ مدد و استعانت کی دو قسمیں: وہ مدد جو ظاہری اسباب و وسائل کے تحت ایسے شخص سے لی جائے جو حاضر اور مدد کرنے کی ظاہری قدرت رکھتا ہو، ایسی مدد اس شخص سے لی جاسکتی ہے۔ جبکہ ایسی مدد جو ظاہری اسباب سے ہٹ کر مافوق الفطرت طریقہ سے ہو وہ صرف اللہ کی ذات سے جائز ہے۔

(اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمِ) یہ ہے اس سورت کا بنیادی مقصد اور وہ یہ کہ اللہ رب العزت سے سیدھی راہ کی ہدایت مانگنا، جس ہدایت پانے میں دنیا و آخرت کی فلاح و کامیابی ہے، ہدایت کی دو قسمیں ہیں: (۱) ہدایت توفیق و عمل، اور یہ ہدایت بخشنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، کائنات کی کوئی ہستی یہ ہدایت دینے پر قادر نہیں جیسے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: (إِنَّكَ لاَ تَهْدِيْ مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللهَ يَهْدِيْ مَنْ يَشَاءُ) (بلاشبہ (اے نبی) آپ جس کو چاہو ہدایت نہیں دے سکتے)، (۲) جبکہ ہدایت کی دوسری قسم: ہدایت دلالت اور رہنمائی ہے، جو انبیاء و رسل اور انکے منہج پر چلنے والے دے سکتے ہیں، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے: (وَإِنَّكَ لَتَهْدِيْ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ) (بیشک آپ سیدھی راہ کی راہنمائی کرتے ہو)۔

اس سے ما قبل آیات اس دعاء کے مقدمات ہیں، جو قبولِ دعاء کے لیے وسیلہ کی حیثیت رکھتے ہیں، جس میں اللہ رب العزت کے نام، اسکی صفات اور اپنے نیک عمل کا وسیلہ پیش کیا گیا ہے، اور یہی وہ وسیلہ جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیتے ہوئے فرمایا: (يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوْا اللهَ وَابْتَغُوْا إِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ)، جبکہ اس کے سوا کسی ذات و اشخاص یا ان کے اعمال و جاہ کا وسیلہ یہی وہ شرک ہے جس میں ہر دور کے مشرک مبتلا رہے ہیں، کفار مکہ سے بھی جب کہا جاتا کہ غیر اللہ سے دعائیں فریادیں کیوں کرتے ہو تو جواب دیتے (مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا إِلَى اللهِ زُلْفَى) (ہم تو صرف اس ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ یہ (بزرگ) اللہ کی نزدیکی کے مرتبہ تک رسائی کردیں)۔ اور صراطِ مستقیم اللہ کی کتاب اور نبی کریم ﷺ کی سنت کی اتباع ہے۔

(صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ) دنیا میں طرح طرح کے مذاہب و افکار ہیں، اور ہر کوئی اپنے کو صحیح اور دوسروں کے غلط ہونے کا دعوے دار ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے صراطِ مستقیم پانے والوں کی وضاحت کی کہ وہ ایسے لوگ ہیں جن پر اللہ کا انعام ہوا، اور اللہ کا انعام پانے والے وہ ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے بیان کرتے ہوئے فرمایا: (وَمَنْ يُطِعِ اللهَ وَالرَّسُوْلَ فَأُولَئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ) (اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے تو ایسے لوگوں کا شمار نبیوں، صدیقوں، شہداء اور

صالحین کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام کیا). اور اصل انعام آخرت کی کامیابی اور جنتوں کو پالینا ہے، کیونکہ یہی حقیقی اور دائمی نعمت ہے. اس کے مقابلہ میں دنیا کی نعمتیں عارضی اور ناتمام ہیں، جن کو پانے والے عموماً آخرت کے دائمی عذاب پانے والے ہوتے ہیں.

(غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلاَ الضَّالِّيْن) صحیح ابن حبان میں عدی بن حاتم سے روایت ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ) سے مراد یہود ہیں . اور (الضَّالِّيْن) سے مراد نصاری ہیں. اور اللہ تعالی نے قرآنِ کریم میں ایک سے زیادہ جگہ پہ یہود کے (الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ) ہونے کا بیان فرمایا ہے. جیسا کہ ارشادِ باری تعالی ہے: (وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ الله) (اور اللہ کے غضب کے ساتھ لوٹے)، دوسری آیت میں فرمان ہے: (وَغَضِبَ اللهُ عَلَيْهِم) (اللہ کا اُن پر غضب ہوا). اور یہود پر اللہ کا غضب ہونے وجہ یہ تھی کہ اِن لوگوں نے حق جاننے پہچاننے کے باجود اس پر عمل نہ کیا. اور نصاری کے گمراہ ہونے کی وجہ یہ کہ اِن لوگوں نے حق نہ تو جانا اور نہ ہی اس پر عمل پیرا ہو سکے.

آمین: کا معنی (قبول فرمالے) یہ فاتحہ کا حصہ نہیں ہے، لیکن فاتحہ میں کی جانے والی دعاء پر یہ لفظ کہنا مسنون ہے، صحیح بخاری و مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (جب إمام (غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلاَ الضَّالِّيْن) کہے تو آمین کہو، کیونکہ جس کی آمین فرشتوں کی آمین سے مل گئی اس کے سابقہ گناہ معاف ہو گئے. مزید آپ کا فرمان ہے: (یہود تم سے سب سے زیاد حسد آمین کہنے پر کرتے ہیں. چنانچہ زیاد سے زیادہ آمین کہا کرو) (ابن ماجہ عن ابن عباس)

سورۃالناس Surah An-Naas

ایاتہا 6	114 سُوْرَۃُ النَّاسِ مَکِّيَّۃٌ 21	رکوعہا 1

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ	اَعُوْذُ	بِرَبِّ النَّاسِ ①	مَلِكِ النَّاسِ ②
کہہ دیجئے	میں پناہ میں آتا ہوں	لوگوں کے رب کی	لوگوں کے بادشاہ کی

اِلٰهِ النَّاسِ ③	مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ	الْخَنَّاسِ ④	الَّذِيْ
لوگوں کے معبود کی	وسوسہ ڈالنے والے کی شر سے	(جو) پیچھے ہٹ جانے والا ہے	جو

يُوَسْوِسُ	فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ⑤	مِنَ الْجِنَّةِ	وَ	النَّاسِ ⑥
وسوسہ ڈالتا ہے	لوگوں کے سینوں میں	جنوں سے	اور	انسانوں میں سے

سورۃالناس کی فضیلت میں إمام ھیثمی روایت فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کو دورانِ نماز بچھو نے ڈس لیا، آپ نے نماز سے فارغ ہو کر پانی میں نمک ڈال کر اس پر ملا اور ساتھ ساتھ (قل یا أیہا الکافرون. قل ھو اللہ أحد. قل أعوذ برب الناس) پڑھتے رہے.

(قُلْ) (کہہ دیجیے) اس پیغام کا حصہ ہے جو تبلیغ کے لیے نبی کریم ﷺ پر نازل ہوا. اور آپ کے بعد ہر مسلمان بھی اس کا مخاطب ہے.

(أَعُوْذُ) (میں پناہ لیتا ہوں) پناہ مانگنے سے مراد کسی چیز سے خوف محسوس کرکے اپنے آپ کو اس سے بچانے کے لیے کسی دوسرے کی حفاظت میں آنا. اس کی آڑ لینا، پناہ لینے والا محسوس کرتا ہے کہ جس چیز سے وہ ڈر رہا ہے وہ خود اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا. اور اس سے بچنے کے لیے دوسرے کی ضرورت ہے جو اسے پناہ دینے پر قادر ہو.

پناہ کی ایک قسم یہ کہ: طبعی قوانین کے مطابق عالمِ اسباب کے اندر رہتے ہوئے کسی محسوس و مادّی طاقت سے پناہ حاصل کرنا، جو اسے پناہ دینے پر ظاہری طاقت رکھتی ہو. جیسا کہ دشمن سے بچنے کے لیے قلعہ بند ہونا. یا حاضر و موجود لوگوں سے مدد حاصل کرنا.

اور پناہ کی دوسری قسم وہ ہے جس میں کسی فوق الفطری ہستی کی پناہ لینا، یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ ہستی عالمِ اسباب پر حکمران ہے. جو صرف اللہ رب العزت سے جائز ہے.

اللہ تعالی سے اس کی تین صفات سے یاد کرکے پناہ مانگنے کی تلقین: (بِرَبِّ النَّاسِ) رب کا معنی: پروردگار و مربی و آقا. (ملک الناس) تمام انسانوں کا بادشاہ اور حاکم و فرمانروا. (إلہ الناس) انسانوں کا حقیقی معبود. یہ تینوں صفات بتدریج بیان فرمائی گیں، سب سے پہلے اللہ رب العزت کی ربوبیت (رب الناس) کا بیان جس پر إیمان ہر دور کے لوگوں کی ضرورت رہی ہے، کیونکہ وہ اللہ تعالی کی کائنات میں اس کی عظمت و کبریائی کے آثار دیکھ کر اس کے خالق و مالک ہونے کا انکار نہیں کر سکتے، اور جو ہر چیز کا خالق و مالک ہے وہی حقیقی بادشاہ ہے (وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ فِيْ الْمُلْكِ) (جس کی بادشاہت میں کوئی شریک نہیں)، اسی کا حکم نافذ ہونا چاہیے (ملک الناس)، اور جو ذات خلق و ملک اور حاکمیت و فرمانروائی کی اِن صفاتِ عظیمہ کی مالک ہو وہی حقیقی طور پر عبادت کے لائق ہے، اسی لیے وہ (إلہ الناس) .

اور یہ استعاذہ ایسی ذات سے ہے جو بندوں کی حفاظت پر پوری طرح قادر ہے. اور جو انہیں اپنی مخلوقات کے ہر طرح کے شر سے بچا سکتا ہے. اور اس کے سوا کوئی ہے ہی نہیں جو حقیقت میں پناہ دے سکتا ہو. (وَهُوَ يُجِيْرُ وَلاَ يُجَارُ عَلَيْه) (وہی پناہ دیتا ہے. اور اس کے مقابلہ میں کوئی پناہ نہیں دیا جاتا)

(مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ) (الخناس کے وسوسے کے شر سے) الخناس: وہ شیطان جو ہر انسان پر مقرر کیا گیا ہے، جسے قرآن واحادیث میں قرین کا نام دیا گیا ہے، إرشادِ باری تعالی ہے: (وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطَاناً فَهُوَ لَهُ قَرِيْن) (اور جو رحمٰن کی یاد سے غافل ہو ہم اس پر شیطان مقرر کر دیتے ہیں جو اس کے ہمراہ ہوتا ہے)۔ صحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: (تم میں سے ہر ایک کے ساتھ شیطان مقرر کیا گیا ہے۔ صحابہ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کیا آپ کے ساتھ بھی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، لیکن اللہ تعالی نے میری اس پر مدد فرمائی ہے اور وہ میرا مطیع ہو گیا ہے، لہٰذا وہ مجھے صرف بھلائی کا ہی حکم دیتا ہے)۔ حافظ ابو یعلی انس بن مالک سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (شیطان انسان کے دل پر لگام ڈالے ہوے ہے، جب انسان اللہ کا ذکر کرتا ہے تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے، اور جب ذکر سے غافل ہوتا ہے تو دل پر قبضہ جمالیتا ہے، اور یہی الوسواس الخناس ہے)، چنانچہ خناس وہ شیطان ہے جو غیر محسوس طریقہ سے وسوسہ ڈالنے والا ہے۔

(اَلَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِي صُدُوْرِ النَّاسِ) (جو لوگوں کے سینوں میں وسوسے پیدا کرتا ہے)، وسوسہ سے مراد برا خیال جس کا مقصد بہکانے کا ہے۔ شیطان کی طرف سے لوگوں کے سینوں میں پیدا کیے جانے والے وسوسے مختلف انداز سے ہوتے ہیں، اللہ کی ذات کے بارے میں بہکانا اور بندوں کے حوالے سے بہکانا۔ اللہ تعالی اور اس کی توحید کے بارے شک وشبہات پیدا کرکے شرک میں مبتلا کرنا، بندوں کے بارے ایک دوسرے کو بدگمانی جیسے برے خیالات میں مبتلا کرکے بہکانا اور تفرقہ بازی پیدا کرنا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں رسول اللہ ﷺ کا اُم المؤمنین صفیہ کے ساتھ دو صحابہ کا قصہ بیان ہوا ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: (بیشک شیطان إنسان میں خون کی طرح دوڑتا ہے، اور مجھے خدشہ ہے کہ وہ تمہارے دل میں کوئی غلط وسوسہ ڈال دے)، مزید شیطان کا وسوسہ یہ ہے کہ وہ برائی کو مزیّن کرکے پیش کرتا ہے، اور پھر اس کے ارتکاب پر اکساتا ہے، اور اس کے مدمقابل نیکی و بھلائی سے نفرت دلاتا اور اس سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے، یہی اس کا وطیرہ رہتا ہے جب تک انسان اللہ کے ذکر میں مشغول ہو کر اسے دور نہیں کر دیتا۔ جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے: (وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بالله) (اور اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آنے لگے تو اللہ کی پناہ لے لیا کرو) (وَقُلْ رَّبِّ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْن) (اور دعا کریں کہ اے میرے رب: میں شیطانوں کے وسوسوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں)۔

(مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ) (وہ جنوں اور انسانوں میں سے ہے)، یعنی وسوسہ اندازی کا یہ کام شیاطینِ جن بھی کرتے ہیں اور شیاطینِ إنس بھی (وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوّاً شَيَاطِيْنِ الإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِيْ بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوراً) (اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے جنوں اور انسانوں میں سے دشمن بنائے جو شیطان ایک دوسرے کی طرف وسوسہ ڈالتے)۔ مسند احمد، نسائی اور ابن حبان وغیرہ حضرت ابوذر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا: (اے ابوذر: اللہ تعالی سے انسانی اور جنی شیطانوں سے پناہ مانگو، ابوذر نے فرمایا: کیا انسانوں میں سے بھی شیطان ہوتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں)

انسانوں میں سے وہ شیطان ہیں جو مختلف انداز سے انسانوں کو گمراہی کی ترغیب دیتے ہیں۔ کبھی دین کا لبادہ اوڑھ کر شرک وبدعات کی تعلیم دیتے ہیں، تو کبھی ناصح، مشفق اور خیر خواہی کے روپ میں حرام خوری اور فحاشی وعریانی کے دعوت دیتے ہیں۔

Surah Al-Falaq،سورۃالفلق

ایاتُھا 5 — 113 سُوْرَۃُ الْفَلَقِ مَکِّیَّۃٌ 20 — رُکُوْعُھَا 1

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ	اَعُوْذُ	بِرَبِّ الْفَلَقِ ﴿1﴾
کہہ دیجئے	میں پناہ میں آتا ہوں	صبح کے رب کی

مِنْ شَرِّ	مَا خَلَقَ ﴿2﴾	وَ	مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ
(ہر) اس چیز کے شر سے	جو اس نے پیدا کیا	اور	اندھیری رات کے شر سے

اِذَا	وَقَبَ ﴿3﴾	وَ	مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ	فِی الْعُقَدِ ﴿4﴾
جب	وہ چھا جائے	اور	پھونکیں مارنے والیوں کے شر سے	گرہوں میں

وَ	مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ	اِذَا	حَسَدَ ﴿5﴾
اور	حسد کرنیوالے کے شر سے	جب	وہ حسد کرے

(قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ) (کہہ دیجیے : میں صبح کے رب کی پناہ میں آتا ہوں) اللہ تعالی رب العزت تمام مخلوقات کا رب ہے، جبکہ یہاں اسے رب الفلق کہا گیا ہے، اور فلق کے اصل معنی پھاڑنے کے ہیں. اکثر مفسرین نے اس سے مراد رات کی تاریکی کو پھاڑ کر سپیدۂ صبح کا نکالنا لیا ہے. تاکہ وہ آفات کے ہجوم کو چھانٹ کر میرے لیے عافیت پیدا کردے.. اور (الفلق) کا دوسرا معنی تمام مخلوقات بھی ہے.

(مِنْ شَرِ مَا خَلَقَ) (تمام مخلوقات کے شر سے میں اس کی پناہ مانگتا ہوں)، اُن مخلوقات میں شیطان، انسان، جن، حیوان، حتی کہ انسان کا نفسِ اَمّارہ بھی ہے جو اسے برائی پر اکساتا ہے. اور. شر کی نسبت اللہ کی طرف نہیں، لیکن اسکی نسبت مخلوقات کی طرف ہے. اور مخلوقات کے شر سے پناہ حاصل کرنے کے لیے موزوں ترین استعاذہ اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ ان کے خالق کی پناہ مانگی جائے. کیونکہ وہ اپنی مخلوق پر غالب ہونے کی وجہ سے پناہ دینے پر قادر ہے. اور ان کے شرور سے بھی واقف ہے.

(وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ) (اور اندھیری رات کی تاریکی کے شر سے جب اس کا اندھیرا پھیل جائے) مخلوقات کے شر سے عموماً پناہ مانگنے کے بعد اب بعض خاص مخلوقات کے شر سے خصوصاً پناہ مانگنے کی تلقین. غاسق کے لغوی معنی تاریکی کے ہیں. وقب: کے معنی چھا جانے کے ہیں. تاریکی کے شر سے پناہ مانگنے کی حکمت حدیث میں بیان ہوئی ہے: (جب سورج غروب ہو جائے تو شیاطین پھیل جاتے ہیں ، لہٰذا اپنے بچوں کو گھروں میں سمیٹ لو اور اپنے جانوروں کو باندھ رکھو...)

(وَمِنْ شَرِّ النَّفَاثَاتِ فِيْ الْعُقَدِ) (اور گرہ (لگا کران) میں پھونکنے والیوں کے شر سے) ، عُقَد جمع عُقدہ کی جس کے معنی گِرہ کے ہیں. گرہ میں پھونکنے کا لفظ تمام مفسرین کے ہاں جادو کے لیے استعمال ہوا ہے .

رسول اللہ ﷺ پر جادو کا واقعہ : ۷ ہجری میں یہود کا ایک وفد مدینہ آیا اور لبید بن اعصم یہودی سے مطالبہ کیا کہ نبی اکرم ﷺ پر جادو کیا جاے. بعض روایات میں ہے کہ اس نے خود جادو کیا تھا. اور بعض میں ہے کہ اس کی بہنوں نے آپ ﷺ کے بال مبارک اور کنگھی ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف میں رکھ کر ذروان نامی کنویں کی تہ میں ایک پتھر کے نیچے دبا دیے. اس جادو کا اثر صرف اس حد تک تھا کہ آپ کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کر لیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا تھا. اور یہ اثرات صرف آپ کی ذات کی حد تک محدود تھے، حتی کہ دوسرے لوگوں کو اس کی خبر تک نہ تھی. اور نہ ہی شریعت و عبادت کے حوالے سے اس کا کوئی اثر تھا.

یہ اثرات کچھ عرصہ تک رہے حتی کہ ایک روز جبکہ آپ حضرت عائشہ کے پاس تھے آپ نے بار بار اللہ سے دعا مانگی اور پھر سو گئے. بیدار ہونے پر آپ ﷺ نے حضرت عائشہ سے فرمایا: میں نے جو بات اپنے رب پوچھی تھی وہ اس نے مجھے بتا دی ہے. اور وہ اس طرح کہ نیند کی حالت میں دو فرشتے آپ کے پاس آئے. ایک سر کی طرف اور دوسرا پاؤں کی طرف کھڑے ہوے. ایک نے دوسرے سے پوچھا: انہیں

کیا ہوا ہے. دوسرے نے جواب دیا: ان پر جادو ہوا ہے. اور پھر جادو کرنے کی تفصیلات ذکر کرتے ہیں. اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے حضرت علی حضرت عمار اور حضرت زبیر کو بھیجا. جنہوں نے کنویں سے غلاف برآمد کیا. اس میں کنگھی اور بالوں کے ساتھ ایک تانت میں گیارہ گرہیں دی ہوئیں تھیں. اور موم کا ایک پتلا تھا جس میں سوئیاں چبھوئی ہوئی تھیں. آپ ﷺ معوذتین پڑھتے جاتے جس سے گرہیں کھلتی جاتیں اور سوئیاں نکلتی جاتیں. اور پھر اس کے بعد آپ ﷺ جادو کے اثر سے ایسے نکلے جیسے کوئی شخص بندھا ہوتا ہے. لبید کو بلا کر باز پرس کی تو اس نے اعتراف کر لیا، اور آپ نے بغیر انتقام لیے اسے چھوڑ دیا.

جادو حقیقت ہے یا وہم ہے؟ بعض لوگ اسے وہم قرار دیتے ہیں. وہ اس لیے کہ اس کے اثرات کی کوئی سائنٹفک توجیہ نہیں کی جا سکتی، لیکن بہت سی چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو مشاہدہ میں آتی ہیں لیکن انہیں سائنٹفک طریقہ سے بیان نہیں کیا سکتا. اور جادو کے اثرات سے جسم اور نفس دونوں ہی متاثر ہو سکتے ہیں. اور اکثر و بیشتر آنکھوں کی نظر و خیال کی حد تک ہوتا ہے. جیسا کہ فرعون کے جادوگروں کے بارے ارشادِ باری تعالی ہے: (يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَى) (موسی علیہ السلام کو ان کے جادو سے یہ خیال ہونے لگا کہ رسیاں اور چھڑیاں بھاگ رہی ہیں)، دوسری جگہ ارشاد ہے: (سَحَرُوْا أَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ) (ان (جادوگروں نے) لوگوں کی نظر بندی کر دی، اور ان پر ہیبت طاری کر دی). مگر یہ اثرات اللہ تعالی کے حکم بغیر ممکن نہیں.

جادو کا اثر ختم کرنے کا طریقہ: جادو کا جادو سے توڑ کرنا حرام ہے. لیکن جادو کو شرعی ادعیہ واذکار سے ختم کرنا جائز ہے. جیسا کہ سورہ بقرۃ کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: (لاَ تَسْتَطِيْعُهَا الْبَطَلَةُ) یعنی باطل قوتیں اس سورت کا مقابلہ نہیں کر سکتیں). مزید فرمان ہے: (جس گھر میں سورت بقرۃ پڑھی جائے تین دین تک شیطان وہاں داخل نہیں ہوتا). اس کے ساتھ ساتھ مزید آیت الکرسی. تینوں قل. صبح وشام کے اذکار کا اہتمام کیا جائے. اور گھر کو شیطانی آلات سے پاک کیا جائے.

جادو کا حکم: جادو سیکھنا، سکھانا اور اس کا کرنا کفر ہے. ارشادِ باری تعالی ہے: (وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ) (سلیمان علیہ السلام نے تو کفر نہ کیا، بلکہ یہ کفر شیطانوں کا تھا جو لوگوں کو جادو سکھاتے تھے)

(وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ) (اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے) حسد کا مطلب کسی شخص کو اللہ کی دی ہوئی نعمت یا خوبی پر اس سے جلنا. اور حسد کرنے والوں میں وہ شخص بھی شامل ہے جو اپنی نظر سے کسی کو نقصان پہنچائے، کیونکہ ایسی نظر کسی شر پسند حاسد سے ہی صادر ہوتی ہے، حسد کا جرم بیان کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (حسد کرنے سے بچو، کیونکہ حسد ایسے ہی نیکیوں کو کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑیوں کو جلا دیتی ہے)

اِن شرور سے بچنے کا یہ طریقہ ہے کہ: (۱) اللہ تعالی پر حقیقی توکل اور اسی کی طرف اپنے معاملات کو سونپنا. (۲) ذکر واذکار اور صبح وشام کے ورد کرنا. (۳) قرآنِ کریم کی تلاوت اور خصوصاً تینوں قل. آیت الکرسی، سورۃ البقرۃ، سورۃ الفاتحہ کی تلاوت کا کثرت سے اہتمام کرنا.

اٰیَاتُهَا ٤ — ١١٢ سُوْرَةُ الْاِخْلَاصِ مَكِّيَّةٌ ٢٢ — رُكُوْعُهَا ١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ	هُوَ اللّٰهُ	اَحَدٌ ﴿١﴾	اَللّٰهُ الصَّمَدُ ﴿٢﴾	لَمْ يَلِدْ
کہہ دیجئے	وہ اللہ	ایک ہے	اللہ بے نیاز ہے	نہ اس نے (کسی کو) جنا

وَلَمْ	يُوْلَدْ ﴿٣﴾	وَلَمْ	يَكُنْ	لَّهٗ	كُفُوًا	اَحَدٌ ﴿٤﴾
اور نہ	وہ (خود) جنا گیا	اور نہیں	ہے	اس کا	ہمسر	کوئی ایک

وجہ تسمیہ: ہر سورت کا نام اس میں مذکور ہوتا ہے، جبکہ اس سورت کا نام اس کے موضوع کے اعتبار سے ہے، کیونکہ اس میں خالص توحید اور اللہ رب العزت کی صفت بیان کی گئی ہے جس لیے اسے سورۃ الاخلاص کا نام دیا گیا ہے، دوسرا یہ کہ جو شخص اس سورت کو عمل میں لاتے ہوئے اور اس میں بیان عقیدہ توحید کو اپناتے ہوئے تلاوت کرے تو اسے شرک سے خلاصی ہو جاتی ہے۔

فضیلت و اہمیت: بخاری و مسلم کی صحیح روایات میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ سورت ایک تہائی (1/3) قرآن کے برابر ہے، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو یہ سورت تلاوت کرتے ہوے سنا تو فرمایا کہ اس کے لیے جنت واجب ہو گئی ہے،۔ اس کی اہمیت و فضیلت کے پیشِ نظر ہی رسول اللہ ﷺ فجر و مغرب کی سنتوں اور وتر و طواف کی رکعتوں میں اس سورت کے پڑھنے کا اہتمام کرتے۔ صحیح بخاری کی روایات میں ہے کہ بعض صحابہ جماعت کرواتے ہوئے اس سورت سے اپنی قراءت ختم کرتے ۔آپ نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اس میں رحمان کی صفت بیان کی گئی ہے اس لیے مجھے اس کا پڑھنا محبوب ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: (أَخْبِرُوْهُ أَنَّ اللهَ تَعَالَى يُحِبُّهُ)اسے بتا دو کہ اللہ تعالی اس سے محبت کرتا ہے، اور دوسرے واقعہ میں آپ نے فرمایا: (حُبُّكَ إِيَّاهَا أَدْخَلَكَ الْجَنَّةَ) تمہاری اس سورت سے محبت نے تمہیں جنت میں داخل کر دیا۔اس فضیلت کا راز اس توحید میں ہے جو اس سورت کا موضوع ولبّ لباب ہے، جس سے معلوم ہوا کہ توحیدِ باری تعالی ہی وہ عملِ جلیل ہے جس سے ہر اُس چیز کی قدر وشان بڑھ جاتی ہے جو توحید پر مبنی ہو۔

زمانہ نزول: مکہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی۔ جب مشرکین نے آپ ﷺ سے آپکے رب کے بارے سوال کیا۔

سبب نزول: ترمذی اور مسندِامام احمد میں مختلف صحابہ سے روایت ہے کہ مشرکینِ قریش نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ ہمیں اپنے رب کا نسب بتائیے، جس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ اور ابن عباس وانس بن مالک وغیرہ سے روایت ہے کہ اس طرح کا سوال یہود ونصاری نے آپ ﷺ سے کیا تھا۔

موضوع ومضمون: جب رسول اللہ ﷺ توحید کی دعوت لے کر اٹھے اس وقت مشرکین ان خداوں کی پوجا کر رہے تھے جو لکڑی، پتھر، سونے، چاندی وغیرہ کے بنے ہوے تھے۔ان کی باقاعدہ نسل چلتی تھی۔ اور انہیں کھانے پینے کی ضرورت بھی لاحق ہوتی تھی۔ یہود

ونصاری بھی اس طرح کے تصورات سے پاک نہ تھے. اس حالت میں جب اللہ وحدہ لا شریک کو ماننے کی دعوت دی گئی تو مشرکین کے ذہن میں یہ سوالات پیدا ہوئے کہ وہ رب کس قسم کا ہے جسے تمام معبودوں کو چھوڑ کر تسلیم کرنے کی دعوت دی جارہی ہے. چنانچہ قرآن کریم نے ان کا جواب چند الفاظ میں دے کر اللہ کی ہستی کا تصور واضح کیا جو تمام مشرکانہ تصورات سے مختلف تھا.

آیات کی تفسیر:

لفظِ (قُل) (کہہ دیجیے) کے سب سے پہلے مخاطب رسول اللہ ﷺ ہیں. اور آپ کے بعد ہر مسلمان اس کا مخاطب ہے.

(هُوَ اللهُ أحَد) (وہ اللہ یکتا ہے) یعنی جس اللہ کی عبادت کی طرف تمہیں دعوت دے رہا ہوں وہ وہی ہستی ہے جسے تم اللہ کے نام سے جانتے ہو. کیونکہ عربوں کے ہاں لفظ (اللہ) جانا پہچانا تھا. زمانہ قدیم سے وہ خالقِ کائنات کو اسی لفظ سے جانتے تھے. اور اپنے دوسرے معبودوں کے لیے یہ لفظ استعمال نہیں کرتے تھے. قرآنِ کریم میں مختلف جگہوں پہ اللہ تعالی کے بارے یہ عقیدہ بیان کیا گیا ہے. سورۃ یونس میں ہے: (قُلْ مَن يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالأَرْضِ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالأَبْصَارَ وَمَنْ يُخرِجُ الْحَيَّ مِنَ المَيِّتِ وَيُخرِجُ المَيِّتَ مِنَ الحَيِّ وَمَنْ يُدَبِّرُ الأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللهُ) (ان سے پوچھو، کون ہے جو تم کو آسمان وزمین سے روزی دیتا ہے؟ سننے دیکھنے طاقتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ اور کون زندہ کو مردہ اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے؟ اور کون اس نظامِ عالم کی تدبیر کرتا ہے؟ تو یہ ضرور کہیں گے: اللہ). (آیت ۳۱). اسی طرح کا بیان سورت بنی إسرائیل، مؤمنون، عنکبوت، زخرف وغیرہ میں ہے. اس جواب سے یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ جسے تم ساری کائنات کا خالق، مالک، رازق، مدبر و منتظم مانتے ہو، اور سخت وقت آنے پر سب خداؤں کو بھول کر اسی کو پکارتے ہو، وہی میرا رب ہے اور اسی کی بندگی کی طرف تمہیں بلاتا ہوں.

لفظ (أحَد) غیر اضافی طور پر صرف اللہ کی ذات کے لیے استعمال ہوا ہے. وہ ذات جس کے بارے تم سوال کرتے وہ اللہ یکتا و یگانہ ہے، اس کا کوئی ثانی نہیں، جیسے تم اس بات کا اقرار کرتے ہو کہ کسی دوسرے کا اسکی رُبوبیت میں کوئی حصہ نہیں، ایسے ہی اُلوہیت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں.

وہی اکیلا ہر چیز کا خالق ومالک ومدبر و منتظم ہے، نہ وہ کسی کا محتاج اور نہ ہی اس کا کوئی شریک وساجی ہے، وہی مختارِ کل ہے جس کے اختیارات میں کسی کا کوئی دخل نہیں، حتی کہ سرورِ کونین امام الانبیاء کو بھی فرمادیا: (لَيْسَ لَكَ مِنَ الأَمْرِ شَيْءٌ) (اے محمد ﷺ) آپ کے اختیار میں کچھ نہیں) (آل عمران: 128)، سورہ جن میں ارشادِ باری تعالی ہے: (قُلْ إِنِّيْ لاَ أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرّاً وَلاَ رَشَداً(21) قُلْ إِنِّيْ لَنْ يُجِيْرَنِيْ مِنَ اللهِ أَحَداً وَلَنْ أَجِدَ مِنْ دُوْنِهِ مُلْتَحَداً (22) (کہہ دیجیے کہ مجھے تمہارے کسی نقصان کا اختیار نہیں (21) کہہ دیجیے کہ مجھے ہر گز کوئی اللہ سے بچا نہیں سکتا (22)) اگر جہانوں کے امام، نبیوں کے سردار کا اللہ کے اختیارات میں کچھ حصہ نہیں تو پھر دوسرا کون ہوگا جسے اس طرح اختیارات ہوں؟!!!)، اور جو مختارِ کل، رب العالمین، احکم الحاکمین ہے وہی ہر طرح کی عبادتوں کے لائق ہے، اس کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں ہے، مگر افسوس کہ آج مسجدیں خالی اور آستانے ودرگاہیں آباد ہیں، غیر اللہ کو مشکل کشا اور حاجت

روا سمجھ کر پکارا جاتا ہے، کائنات کی تدبیر اور موت وحیات کے اختیارات اللہ تعالی سے چھین کر بندوں کے ہاتھ میں دے دیے گئے ہیں، بلکہ جنت وجہنم سے بھی اللہ تعالی کو بے اختیار کرکے اسکی چابیاں پیروں ملاؤں کے ہاتھ میں تھمادی ہیں. کسی نے خوب کہا ہے:

(غیروں سے تجھے امیدیں اللہ سے ناامیدی مجھے بتا تو سہی کہ اور کافری کیا ہے؟)

(اَللّٰهُ الصَّمَدُ) (اللہ بے نیاز ہے) صمد کے معنی میں جامع ترین عبارت یہ ہے کہ: وہ ذات جو ہر طرح کی کامل صفات کی مالک ہے، اور تمام مخلوقات اس کی محتاج ہیں، صحابہ وتابعین سے اس لفظ کے بارے منقول تفاسیر کا خلاصہ یہ ہے: بلند مقام، بڑی ضخامت والا، ہر چیز سے بالاتر، وہ سردار جس کی اطاعت کی جاتی ہو، اور اس کے بغیر کسی کا فیصلہ نہ چلتا ہو، وہ ٹھوس چیز جس میں کوئی خول جھول نہ ہو، قابل تجزیہ و تقسیم نہیں، جو کھاتا پیتا نہ ہو، وہ جو سب سے بے نیاز ہو، اور سب اس کے محتاج ہوں.

(لَمْ يَلِدْ. وَلَمْ يُوْلَدْ) (نہ اسکی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے) یہ مشرکین کے ان تصورات کا رد ہے جس میں وہ خیال کرتے تھے کہ خداؤں کی کوئی جنس ہوتی ہے. اور توالدُ وتناسل کا سلسلہ چلتا ہے، مشرکینِ مکہ نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا، یہود نے عزیر علیہ السلام کو اور نصاری نے عیسی علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنادیا. (إِنَّمَا اللهُ إِلَهٌ وَاحِدٌ سُبْحَانَهُ أَنْ يَكُوْنَ لَهُ وَلَد) اللہ تو صرف ایک ہی معبود ہے. وہ پاک ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو، (أَلاَ إِنَّهُمْ مِنْ إِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ وَلَدَ اللهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُوْن) خبردار یہ لوگ اللہ پر افتراء بازی کرتے ہوئے اسکی اولاد قرار دیتے ہیں اور بیشک یہ جھوٹے لوگ ہیں)، اللہ رب العزت کی کوئی اولاد نہ ہونا اس لیے کہ (۱) اس کے مثل کوئی نہیں، جبکہ اولاد ماں باپ جیسی اور ان کا حصہ ہی ہوتی ہے، (۲) اولاد تعاون ومدد اور بقاء نسل جیسی حاجت وضرورت کے لیے ہوتی ہے، جبکہ اللہ تعالی کسی کا محتاج نہیں اور نہ اس کو کبھی زوال ہے.

(وَلَمْ يُوْلَدْ) کیونکہ اللہ تعالی (الأول) ہے جس سے قبل کچھ نہیں، تو وہ کیسے کسی کا بیٹا ہو سکتا ہے.

(وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُواً أَحَد) (اور کوئی اسکا برابری کرنے والا نہیں) کُفُو کا استعمال: نظیر، مشابہ، ہم رتبہ، مساوی اور برابری کے لیے ہوا ہے. جس کا معنی یہ کہ کائنات میں کوئی نہ تھا اور نہ ہو سکتا ہے جو اللہ کی مانند، اس کا ہم پلہ، یا اپنی صفات واختیارات میں اس کا مشابہ ہو. صحیح بخاری میں حدیثِ قدسی ہے، اللہ تعالی نے فرمایا: (انسان مجھے گالی دیتا ہے، یعنی میرے لیے اولاد ثابت کرتا ہے، حالانکہ میں ایک ہوں، بے نیاز ہوں، میں نے نہ تو کسی کو جنا ہے، اور نہ میں کسی سے پیدا ہوا ہوں، اور نہ کوئی میرا ہمسر ہے). اور جب کائنات میں اس کی برابری کرنے والا کوئی نہیں تو اس سے بڑھ کر کیونکر ہو سکتا ہے؟

ایاتھا 5 — 111 سُوْرَۃُ اللَّھَبِ مَکِّیَّۃٌ 6 — رکوعھا 1

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تَبَّتْ	یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ	وَّ تَبَّ ﴿1﴾	مَآ اَغْنٰی	عَنْهُ مَالُهٗ	وَمَا كَسَبَ ﴿2﴾
ٹوٹ جائیں	دونوں ہاتھ ابولہب کے	اور وہ ہلاک ہوگیا	نہ کام آیا	اس کے اس کا مال	اور (نہ) جو اس نے کمایا

سَیَصْلٰی	نَارًا	ذَاتَ لَھَبٍ ﴿3﴾	وَّ	امْرَاَتُهٗ
عنقریب وہ داخل ہوگا	آگ میں	شعلے والی	اور	اس کی بیوی (بھی)

حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ﴿4﴾	فِیْ جِیْدِھَا	حَبْلٌ	مِّنْ مَّسَدٍ ﴿5﴾
(جو) ایندھن اٹھانے والی ہے	اس کے گلے میں	رسی ہوگی	مضبوط بٹی ہوئی

وجہ تسمیہ: پہلی آیت سے لیا گیا ہے جس میں لفظ (لَھَب) آیا ہے، اس کا دوسرا نام (المُسَد) ہے، جو اس سورت کا آخری لفظ ہے.

زمانہ نزول: اس کے مکی ہونے میں مفسرین میں کوئی اختلاف نہیں، لیکن اس کے نزول کے وقت کی تعیین اگرچہ واضح نہیں، مگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سورت ان حالات میں نازل ہوئی جب ابولہب کی مخالفت حد سے گذر گئی تھی.

موضوع ومضمون: قرآنِ کریم کا یہ وہ ایک ہی مقام ہے جہاں دشمنانِ اسلام میں سے کسی شخص کا نام لے کر اس کی مذمت کی گئی ہے، اگرچہ نبی کریم ﷺ کے کئی دوسرے دشمن ابولہب سے کم نہ تھے، لیکن اِس کا بطور خاص نام لینے کی وجہ یہ ہے کہ عربی معاشرے میں صلہ رحمی کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اور قطع رحمی بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا تھا، یہی وجہ ہے کہ قریش کے دوسرے تمام خاندانوں کی تو شدید مخالفت رہی، لیکن بنی ہاشم اور بنی مطلب نے آپ ﷺ پر ایمان نہ لانے کے باوجود آپ کی حمایت کی، اس اخلاقی اصول کو جسے جاہلیت میں بھی لوگ واجب الاحترام سمجھتے تھے صرف ابولہب نے توڑا، جو کہ آپ ﷺ کا حقیقی چچا تھا، اور عرب میں چچا باپ کی جگہ سمجھا جاتا ہے.

بخاری ومسلم کی روایات میں ہے کہ جب آپ کو دعوتِ عام دینے کا حکم دیا گیا تو آپ نے صفا پہاڑی پر چڑھ کر (وَا صَبَاحَاہ) (ہائے صبح کی آفت) کی آواز لگائی، جو کسی بڑے پیش آنے والے خطرے کی آواز تھی، یہ سن کر قریش کے تمام خاندان آپ کی طرف دوڑے، جب سبھی جمع ہوگئے تو آپ نے فرمایا: اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر تم پر حملہ کرنے کو تیار ہے تو تم میری بات سچ مانوگے؟ لوگوں نے کہا: ہاں، ہمیں کبھی تم سے جھوٹ سننے کا تجربہ نہیں ہوا۔ تو اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ آگے سخت عذاب آرہا ہے۔ جس پر ابولہب نے کہا: تَباً لَکَ أَلِهَذا جَمَعْتَنَا؟ (ستیاناس جائے تیرا، کیا تو نے ہمیں اس لیے جمع کیا تھا).

مزید یہ کہ ابولہب رسول اللہ ﷺ کا قریب ترین ہمسایہ تھا، اس کے علاوہ عقبہ بن ابی معیط اور حکم بن عاص بھی آپ کے ہمسائے تھے، اِن لوگوں نے آپ کو تنگ کرنے میں کوئی کمی نہ چھوڑی، آپ کے گھر میں غلاظتیں پھینکتے، ابولہب کی بیوی اُم جمیل آپ کے دروازے پر کانٹے پھینک دیتی، حتی کہ آپ ﷺ اُن لوگوں سے فرماتے اے بنی عبد مناف یہ کیسی ہمسائگی ہے؟

نبوت سے قبل آپ دو کی بیٹیوں : رقیہ اور ام کلثوم کی شادی ابولہب کے دو بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے ہو چکی تھی، جب آپ دعوت لے کر اٹھے تو ابولہب نے ان سے کہا کہ میرے لیے تم سے اس وقت تک ملنا حرام ہے جب تک تم محمد کی بیٹیوں کو طلاق نہ دو، چنانچہ انہوں نے انہیں طلاق دے دی، بلکہ عتیبہ تو جہالت میں اس قدر بڑھا کہ اس نے آپ ﷺ کے منہ پر تھوک دیا، جو آپ پر نہیں پڑا، اور اپ کی بدعاء کی وجہ سے سفر شام کے دوران اسے شیر نے پھاڑ کھایا.

ابولہب کی دشمنی کی انتہاء یہ تھی کہ جب آپ دعوت دینے کے لیے نکلتے تو یہ شخص آپ کے پیچھے پیچھے رہتا تاکہ لوگوں کو آپ کی بات سننے سے روکے، مسند احمد وغیرہ میں ربیعہ بن عباد الدیلی بیان کرتے ہیں کہ میں ذوالمجاز کے بازار میں اپنے باپ کے ساتھ، جہاں آپ ﷺ کو دیکھا کہ آپ کہہ رہے تھے : لوگو : لاإلہ إلا اللہ کہہ دو فلاح پا جاؤ گے، اور آپ کے پیچھے پیچھے ایک شخص کہتا جارہا تھا: یہ جھوٹا ہے، دینِ آبائی سے پھرا ہوا ہے، اس کی بات نہ مانو، بعض روایات میں ہے کہ وہ آپ کو پتھر مارتا حتی کہ آپ کی ایڑیاں خون سے تر ہو گئیں، میں نے پوچھا یہ کون شخص ہے؟ لوگوں نے کہا یہ ان کا چچا ابولہب ہے، ابولہب کی انہیں حرکات کے پیش نظر یہ مکمل سورت اس کی مذمت میں نازل ہوئی، سورت کے نازل ہونے پر اُس نے غصہ سے اَول فول بکنا شروع کر دیا تو لوگوں کو معلوم تھا کہ یہ شخص رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں دیوانہ ہوا ہے، اس لیے اسکی کوئی بات قابل اعتبار نہیں، اور ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو گیا کہ آپ ﷺ دین کے معاملہ میں کسی کے ساتھ مداہنت نہیں برتنے والے.

ابولہب کا نام عبدالعزی تھا، اسے ابولہب اس لیے کہا جاتا تھا کہ اس کا رنگ سرخ وسفید شعلہ مارتا تھا، لہب آگ کے شعلے کو کہتے ہیں.

آیات کی تفسیر :

(تَبَّتْ يَدَا أَبِيْ لَهَبٍ وَتَبَّ) (ٹوٹ گئے ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ تباہ ہو گیا)، یہ ایک پیشین گوئی ہے جسے ماضی کے صیغہ میں بیان کیا گیا ہے، جس میں اس کے یقینی ہونے کا معنی ہے، ہاتھ ٹوٹنے سے مراد جسمانی ہاتھ ٹوٹنا نہیں، بلکہ جس مقصد کے لیے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا اس میں مکمل طور پر ناکام ہو جانا ہے، چنانچہ ابولہب نے رسول اللہ ﷺ کی جس دعوت کو مٹانے کی پر زور کوششیں کیں تھیں اللہ تعالی نے اسے بری طرح ناکام کیا، معرکہ بدر میں کفر کے بڑے بڑے سردار مارے گئے، یہ خبر سن کر ابولہب کو بہت رنج ہوا، اور وہ عدسہ (Maliganant Pustule) کی بیماری میں مبتلا ہو کر عبرتناک طریقہ سے ہلاک ہو گیا.

(مَا أَغْنَى عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ) (اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا اس کے کام نہ آیا) ابولہب زر پرست اور کثیر المال شخص تھا حتی کہ وہ قریش کے ان چار آدمیوں میں سے تھا جو ایک قنطار (تقریباً 7.5 کلو) سونے کے مالک تھے، لیکن یہ مال اس کے ہر گز کام نہ آ سکا، (وَمَا كَسَبَ) سے مراد اس کی اولاد ہے، جنہوں نے اسے بے کسی کی موت مرتے چھوڑ دیا، اور غلاموں کے ذریعہ اس کی لاش گڑھے میں پھینکوادی. اور دینِ اسلام قبول کر کے ابولہب کے دین کی جڑ کاٹ دی.

(سَيَصْلَى نَاراً ذَاتَ لَهَبٍ) (ضرور وہ شعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا) یہ اسکی آخرت کا انجام ہے، جو اس کی کفر پر موت اور جہنمی ہونے کی واضح دلیل ہے.

(وَامْرَأَتُهُ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ) (اور (اس کے ساتھ) اسکی بیوی بھی، لگائی بجھائی کرنے والی) اس عورت کا نام اَروی اور اسکی کنیت ام جمیل تھی، جو اسلام دشمنی میں اپنے شوہر کے شانہ بشانہ تھی، جب اس نے یہ سورت سنی تو بپھری ہوئی مٹھی میں پتھر لیے نبی کریم ﷺ کی تلاش میں نکلی۔ حرم پہنچی تو وہاں آپ ﷺ ابوبکرؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ وہاں آ کر ابوبکرؓ سے کہنے لگی: میں نے سنا ہے کہ تمہارے صاحب نے میری ہجو (توہین) کی ہے، ابوبکرؓ نے فرمایا: اس گھر کے رب کی قسم، انہوں نے تمہاری کوئی ہجو نہیں کی۔ اور پھر آپ ﷺ کو دیکھے بغیر واپس چلی گئی۔

(حَمَّالَةَ الْحَطَبِ) مفسرین نے اس کے متعدد معانی بیان کیے ہیں، ابن عباس وغیرہ کا کہنا ہے کہ: وہ راتوں کو خاردار ٹہنیاں لا کر رسول اللہ ﷺ کے دروازے پر ڈالتی تھی، بعض کا کہنا ہے کہ چغلیاں کھاتی پھرتی تھی، بعض کا کہنا ہے کہ جہنم میں ابولہب پر آگ تیز کرنے کے لیے لکڑیاں ڈالے گی۔

(فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِنْ مَّسَدٍ) (اس کی گردن میں مونجھ کی رسی ہوگی) جید عربی میں ایسی گردن کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں زیور پہنا گیا ہو، اور یہ عورت اپنی گردن میں بہت قیمتی ہار پہنتی تھی اور قسم کھاتی کہ اسے بیچ کر محمد کی عداوت میں استعمال کرے گی، تو یہاں جید کا لفظ بطور طنز استعمال کیا گیا ہے، کہ اس کی اس مزیّن گردن میں دوزخ میں مونجھ کی رسّی پڑی ہوگی، جس میں اسکی توہین اور عذاب دونوں ہی ہیں۔

سورۃ اللہب کا اہم ترین سبق:

عصرِ نبوت میں ہمارے سامنے دو شخص اور ان کا کردار ہے، ایک طرف مذکورہ سورت میں ابولہب، جو کہ نہ صرف یہ کہ وہ قریشی ہاشمی، اہلِ مکہ کے سرداروں میں سے ایک مالدار شخص تھا، بلکہ رسول اللہ ﷺ کا حقیقی چچا، آپ کا ہمسایہ، اور آپ کی دو بیٹیوں کا سسر بھی تھا، خوبصورتی و حسن و جمال میں اس کا رنگ سرخ و سفید شعلہ مارتا تھا، لیکن جب ایمان و ہدایت اور تقوی و طاعت سے بہرہ ور نہ ہوا تو اس کا حسب و نسب، مال و زر اور سرداری ہر گز کام نہ آئی، بلکہ اس کی مذمت کرتے ہوئے قرآن میں ایک مکمل سورت نازل ہو گئی، اور رہتی دنیا بلکہ آخرت میں بھی ذلت و خواری کی مثال بن گیا، دوسری شخصیت: سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی ہے، جو سیاہ فام، موٹے موٹے نقوش کے حبشی النسب، زر خرید غلام تھے، کسمپرسی کی یہ حالت کہ گلے میں رسی ڈال کر مکہ کی گلیوں میں گھسیٹے جاتے، دھکتے انگاروں پر لٹا کر سینے پر بھاری پتھر رکھ دیا جاتا، لیکن جب یہ سینہ ایمان و توحید اور تقوی و طاعت سے مزیّن تھا تو زمین پر چلنے والے بلال کے قدموں کی آہٹ جنت میں سنائی دیتی تھی، وہ ہستی جس کی جنت شدت سے منتظر تھی وہ بلال تھے، مکہ فتح ہوتا ہے تو کعبہ کی چھت پر چڑھ کر کلمہ توحید بلند کرنے والے یہی بلال تھے، کعبہ کے آس پاس معبودانِ کفر کو نیست و نابود کرنے والے بلال ہی تھے، تو اس سورت سے حاصل ہونے والا اہم ترین سبق یہ ہے کہ اللہ تعالی کے ہاں برتری و فضیلت کا معیار ایمان و تقوی ہے، نہ کہ حسب و نسب یا مال و جمال، کیونکہ یہ تو وہ چیزیں ہیں جو محض عطاء خداوندی ہے، کسی انسان کا ان میں کوئی کسب و اختیار نہیں۔

اٰيَاتُهَا 3	110 سُوْرَةُ النَّصْرِ مَدَنِيَّةٌ 114	رُكُوْعُهَا 1

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا	جَآءَ	نَصْرُ اللّٰهِ	وَ الْفَتْحُ ۝1	وَ رَاَيْتَ	النَّاسَ ۝3
جب	آجائے	اللہ کی مدد	اور فتح	اور آپ دیکھیں	لوگوں کو

يَدْخُلُوْنَ	فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ	اَفْوَاجًا ۝2	فَسَبِّحْ ۝4
(کہ) وہ سب داخل ہو رہے ہیں	اللہ کے دین میں	فوج در فوج	تو آپ تسبیح بیان کیجئے

بِحَمْدِ رَبِّكَ	وَاسْتَغْفِرْهُ ۝5	اِنَّهٗ	كَانَ	تَوَّابًا ۝3
اپنے رب کی تعریف کے ساتھ	اور بخشش مانگیے اس سے	بیشک وہ	ہے	بہت توبہ قبول کرنیوالا

نام: سورت کی پہلی آیت میں مذکور لفظِ (نصر) سے لیا گیا ہے.

زمانہ نزول: صحیح مسلم وغیرہ کی روایت میں عبداللہؓ بن عباسؓ کا فرمان ہے کہ یہ قرآن کریم کی آخری سورت ہے، اس کے بعد کوئی مکمل سورت نازل نہیں ہوئی، یعنی اس سورت کے بعد صرف بعض آیات نازل ہوئیں، سنن ترمذی وغیرہ میں عبداللہؓ بن عمرؓ نے مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ سورت حجۃ الوداع کے موقع پر ایام تشریق کے درمیان منیٰ میں نازل ہوئی، جبکہ آپ ﷺ اونٹنی پر سوار ہو کر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے.

موضوع ومضمون:

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرمایا ہے کہ جب مکہ فتح ہو جائے، اور لوگ دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگیں تو اس کا یہ معنی ہے کہ جس مقصد کے لیے آپ ﷺ کو دنیا میں بھیجا گیا تھا وہ مکمل ہو چکا، چنانچہ اپنے مقصد کے اختتام پہنچنے پر اللہ کی حمد وثنا بیان کریں اور آخرت کی تیاری کرتے ہوئے استغفار کریں. اس بات کی وضاحت صحیح بخاری میں ابن عباسؓ کے اس فرمان سے ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ مجھے غزوہ بدر میں شرکت کرنے والے بڑے بڑے شیوخ کی مجلس میں بلاتے تھے، جس پر بعض بزرگوں کو ناگواری گزری اور کہا کہ ہمارے لڑکے بھی تو اسی لڑکے جیسے ہیں، تو اس کو خاص طور پر کیوں ہمارے ساتھ مجلس میں شریک کیا جاتا ہے؟ حضرت عمر نے فرمایا کہ علم کے لحاظ سے اس کو جو مقام حاصل ہے وہ آپ نہیں جانتے۔ پھر ایک روز انہوں نے شیوخ بدر کے بلا بھیجا اور مجھے بھی بلا لیا۔ میں سمجھ گیا کہ آج مجھے اس مجلس میں شرکت کی وجہ دکھانے کے لیے بلایا گیا ہے، دورانِ گفتگو حضرت عمرؓ نے شیوخ بدر سے پوچھا کہ آپ حضرات (إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ) کے بارے کیا جانتے ہیں؟ بعض نے کہا کہ اس میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ جب اللہ کی نصرت آجائے اور ہم کو فتح نصیب ہو تو ہم اللہ کی حمد اور اس سے استغفار کریں۔ بعض نے اس سے شہروں اور قلعوں کی فتح بیان فرمائی، اس کے بعد حضرت عمرؓ نے کہا: ابن عباس، کیا تم بھی یہی کہتے ہو؟ میں نے کہا: نہیں۔ انہوں نے کہا: پھر تم کیا کہتے ہو؟ میں نے عرض کیا: اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کی وفات ہے۔ اس میں نبی کریم ﷺ کو خبر دی گئی ہے کہ جب اللہ کی نصرت آجائے اور فتح نصیب ہو جائے

تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا وقت قریب آ پہنچا، تو آپ اللہ کی حمد واستغفار کریں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: میں بھی اس کے سوا کچھ نہیں جانتا.

یہاں قابلِ غور چیز یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اور کسی عام دنیوی رہنما کے درمیان کتنا عظیم فرق ہے۔ دنیوی رہنما اگر اپنی زندگی میں ہی انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ اس خوشی کا اظہار جشن منا کر اور اپنی قیادت پر فخر کرکے کرتا ہے، جبکہ نبی کریم ﷺ (۲۳) سال کی انتھک محنتوں اور مشقتوں میں قوم کے عقائد وافکار، عادات واخلاق، تہذیب وتمدن، معیشت ومعاشرت کو بالکل بدل کر کسی جشن منانے کی بجائے پوری عاجزی وانکساری کے ساتھ اللہ تعالی کے حمد وثنا اور استغفار کرتے ہیں، بخاری ومسلم میں عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی وفات سے پہلے رکوع وسجدہ میں بکثرت (سُبْحَانَکَ اللَّہُمَّ وَبِحَمْدِکَ . أَسْتَغْفِرُکَ وَأَتُوْبُ إِلَیْک)پڑھا کرتے تھے، یہ قرآن (سورہ نصر) کی تاویل تھی جو آپ نے نے فرمائی تھی. لہٰذا رکوع وسجود میں یہ دعا پڑھنا سنت ہے .

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سورت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ عبادت وریاضت کرنے میں اس قدر مشغول ہو گئے جس قدر اس سے قبل نہ تھے.

آيات كي تفسير :

(إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللهِ وَالْفَتْحُ) (جب اللہ کی مدد اور فتح آ جائے) بعض مفسرین نے فتح سے مراد فتح مکہ لی ہے، کیونکہ اس فتح کے بعد مشرکین عرب کی ہمتیں پست ہو گئیں. اور آپ ﷺ کی دعوت ودینِ اسلام کے ختم ہو جانے کی امیدیں ختم ہو گئیں. مزید یہ کہ بہت سے عربوں کی نظریں مکہ مکرمہ پر تھیں کہ اگر تو یہ شہر مسلمانوں کے زیر نگیں ہو جاتا ہے تو یہ اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے، اور یہی وجہ ہے کہ مکہ فتح ہونے کے بعد ان لوگوں کے اسلام سے متعلقہ شکوک وشبہات دور ہو گئے اور وہ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے. جبکہ بعض دوسرے مفسرین نے اس سے مراد وہ فیصلہ کن فتح لی ہے جس کے بعد ملک میں کوئی طاقت اسلام سے ٹکر لینے کے لیے باقی نہ رہی، اور دینِ اسلام جزیرۃ العرب میں غالب ہو گیا. دونوں معنی وجیہ اور صحیح ہیں.

(وَرَأَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللهِ أَفْوَاجًا) (اور تم لوگوں کو اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہوتے دیکھو)، کبھی وہ زمانہ تھا کہ لوگ ایک ایک دو دو کرکے اسلام میں داخل ہوتے تھے، لیکن فتح مکہ کے بعد پورے پورے قبیلے، اور خاندانوں کے خاندان مسلمان ہونے لگے، اسی لیے (۹ھ) کو عام الوفود کہا جاتا ہے، اور پھر (۱۰ھ) تک پورا عرب اسلام کے زیرِ نگیں ہو چکا تھا.

(فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ إِنَّہُ کَانَ تَوَّابًا) (تو اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اس کی تسبیح بیان کرو اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو. بیشک وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا ہے)، تسبیح سے مراد اللہ تعالی کو ہر لحاظ سے اور ہر ایسی چیز سے پاک ومنزّہ قرار دینا ہے جو اللہ تعالی کی ذات کے لائق نہ ہو، یا اس کی صفات میں کسی نقص وکمزوری پر دلالت کرتی ہو۔ اور اللہ تعالی کو ہر اس عیب سے پاک قرار دینا جو کافر ومشرک اللہ تعالی کے بارے میں تصور رکھتے ہوں.

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالی کی تسبیح بیان کرنے سے یہ مراد ہے کہ اسے ہر عیب وبرائی سے پاک قرار دینا، اور اس کے لیے صفاتِ کاملہ ثابت کرنا ہے۔ تسبیح تنزیہ و تعظیم کا تقاضا کرتی ہے، اور تعظیم کا تقاضا ہے کہ اس کی حمد وثنا بیان کی جائے، چنانچہ لفظ تسبیح میں: پاکیزگی، تعریف، بڑائی اور توحید سبھی پر شامل ہے. (مجموع الفتاوی (125/16)

(حمد) سے مراد اللہ تعالی کا شکر ادا کرتے ہوئے اس کی تعریف وثنا بیان کرنا ہے۔ جس میں آپ ﷺ کو اس بات کی تعلیم دی جارہی ہے کہ غلبہ اسلام کی اس عظیم کامیابی کے متعلق تمہارے دل میں کبھی یہ خیال پیدا نہ ہو کہ یہ تمہارے اپنے کمال کا نتیجہ ہے، بلکہ اسے صرف اللہ تعالی کا فضل واحسان سمجھو، اور اس پر اس کا شکر ادا کرو، اللہ تعالی چاہتا تو یہ کام کسی اور سے بھی لے سکتا تھا۔ مگر اس کا احسان ہے کہ اس نے یہ خدمت آپ ﷺ سے لی، اور آپ ﷺ کے ہاتھوں اس دین کا غلبہ کیا. جس سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ اگر اللہ رب العزت کسی شخص کو اپنے دین کے لیے اختیار کرتا ہے اور اس سے دین کا کام لیتا ہے تو یہ محض اللہ تعالی کا اس پر انعام ہے، نہ کہ اس شخص کا دین پر کوئی احسان نے (بَلِ اللهَ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلإِيْمَانِ) (بلکہ اللہ تعالی تم پر احسان کرتا ہے کہ جو تمہیں ایمان کی ہدایت دی).

(وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا) استغفار کے معنی مغفرت یعنی بخشش طلب کرنا ہے، اور بخشش اس وقت طلب کی جاتی ہے جب کوئی غلطی سرزد ہو جائے۔ دعوتِ دین کی تکمیل اور غلبہ اسلام کا فریضہ سرانجام دینے پر نبی کریم ﷺ کو استغفار کرنے کا حکم دیا جارہا ہے کہ منصبِ دعوت ورسالت میں جو بھول چوک یا کمی وکمزوری رہ گئی ہو تو اللہ تعالی اس پر چشم پوشی اور در گزر فرمائے. اور جب یہ ادب رسول اللہ ﷺ کو سکھایا جارہا ہے، جنہوں نے دینِ حق کی خاطر اپنا جان ومال اور لیل نہار ہر چیز صرف کردی (يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرِ. قُمْ فَأَنْذِرِ) (اے کپڑا اوڑھنے والے. اٹھو اور (عذاب الہی) سے ڈراو) کا حکم ملنے سے لے کر اس قدر جہدِ مسلسل اور عملِ پیہم رہا جو الرفیق الاعلی سے ملنے پر ختم ہوا. جس میں ایک مسلمان کے لیے اس بات کا سبق ہے کہ خواہ اس نے کتنی ہی قربانیاں دی ہوں، اور دین کی کتنی بڑی ہی خدمات سر انجام دی ہوں، اور عبادت وریاضت میں جس قدر بھی جانفشانیاں ہوں، بلکہ اپنی جان بھی اللہ کی راہ میں لٹا دینے کے بعد یہی سمجھے کہ: (حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا)، کیونکہ اللہ تعالی کا حق اس سے بہت بالاتر ہے کہ کوئی مخلوق اسے ادا کرسکے۔ اسی لیے آپ ﷺ صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (تم میں سے کوئی بھی اپنے عمل سے جنت میں داخل نہیں ہو سکتا)، صحابہ نے فرمایا: رسول اللہ، حتی کہ آپ بھی؟ آپ نے فرمایا: (حتی کہ میں بھی، مگر یہ کہ اللہ تعالی مجھ پر اپنی رحمت کی نوازشیں کردیے)

دینِ اسلام کا یہ ادب ہمیں مختلف عبادات کے اختتام پر سکھایا گیا ہے: چنانچہ نماز سے سلام پھیر کر تین بار (أستغفر الله) کہنا سنت ہے، تاکہ نماز کے عمل میں کمی کوتاہی کا ازالہ ہو جائے، حج جیسی عبادتِ جلیلہ کرکے بکثرت ذکر واستغفار کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، تاکہ اس میں پیدا ہو جانے والے خلل ونقص کو پورا کیا جاسکے، یہی حکم روزوں اور دوسری عبادتوں میں ہے.

اس ادب میں جس اور بات کی تعلیم ہے وہ یہ کہ زندگی کے آخری ایام میں اللہ تعالی کی حمد وثنا، وتسبیح وتہلیل اور توبہ استغفار کا کثرت سے اہتمام کیا جائے.

تفسیر سورۃ الکافرون Surah Al-Kaafiroon

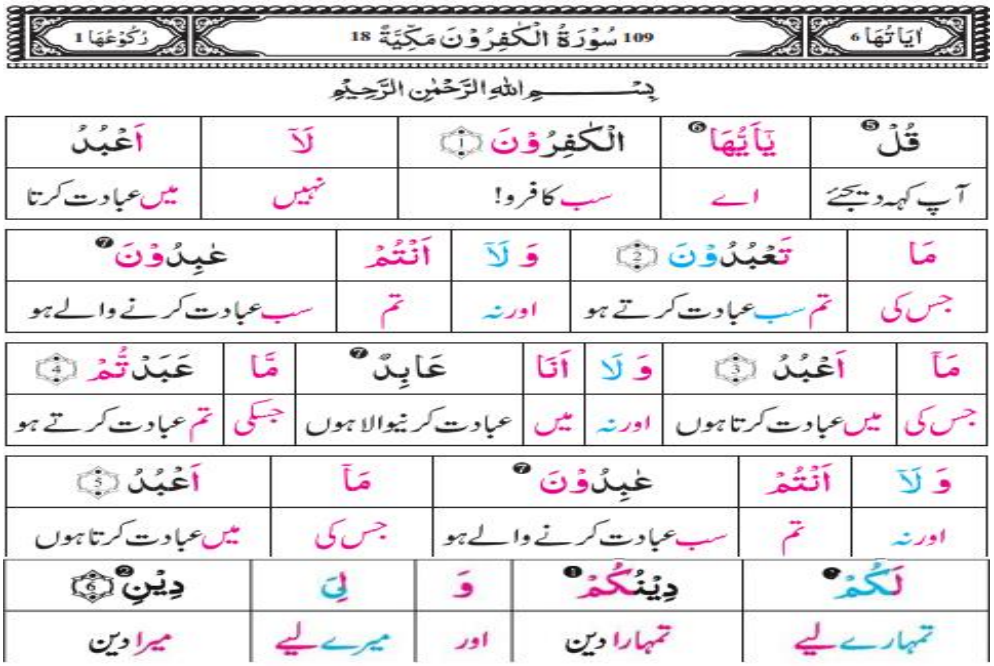

ایاتھا 6 — 109 سُوْرَةُ الْكٰفِرُوْنَ مَكِّيَّةٌ 18 — رکوعھا 1

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ	يٰاَيُّهَا	الْكٰفِرُوْنَ ﴿1﴾	لَآ	اَعْبُدُ
آپ کہہ دیجئے	اے	سب کافرو!	نہیں	میں عبادت کرتا

مَا	تَعْبُدُوْنَ ﴿2﴾	وَلَآ	اَنْتُمْ	عٰبِدُوْنَ
جس کی	تم سب عبادت کرتے ہو	اور نہ	تم	سب عبادت کرنے والے ہو

مَآ	اَعْبُدُ ﴿3﴾	وَلَآ	اَنَا	عَابِدٌ	مَّا	عَبَدْتُّمْ ﴿4﴾
جس کی	میں عبادت کرتا ہوں	اور نہ	میں	عبادت کرنیوالا ہوں	جسکی	تم عبادت کرتے ہو

وَلَآ	اَنْتُمْ	عٰبِدُوْنَ	مَآ	اَعْبُدُ ﴿5﴾
اور نہ	تم	سب عبادت کرنے والے ہو	جس کی	میں عبادت کرتا ہوں

لَكُمْ	دِيْنُكُمْ	وَ	لِيَ	دِيْنِ ﴿6﴾
تمہارے لیے	تمہارا دین	اور	میرے لیے	میرا دین

وجہ تسمیہ: پہلی آیت سے لیا گیا ہے جس میں لفظ (کافرون) آیا ہے.

زمانہ نزول: اکثر مفسرین کے نزدیک یہ مکی سورت ہے، اس کا مضمون بھی مکی ہونے پر دلالت کرتا ہے.

فضیلت واہمیت: یہ سورت شرک سے براءت وبیزاری ہے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ فجر ومغرب کی سنتوں، وتر اور طواف کی پہلی رکعت میں سورت إخلاص اور دوسری رکعت میں اس سورت (سورۃ الکافرون) کے پڑھنے کا اہتمام کرتے. نیز رات کو سوتے ہوئے بھی اسے پڑھتے اور اس کی فضیلت کے بارے فرمایا: (یہ سورت پڑھ کر سوؤگے تو شرک سے بری قرار پاؤگے) جیساکہ حضرت معاذ، خباب، ابن عباس وغیرہ کی صحیح احادیث میں ہے.

موضوع ومضمون: کفارِ قریش آپ ﷺ سے مصالحت کے لیے وقتاً فوقتاً آپ کو تجویزیں پیش کرتے رہتے، تاکہ آپ ان کی بات قبول کرکے حق وباطل کا نزاع ختم کردیں، اِن تجویزوں میں یہ بھی تھا کہ ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی پوجا کرلیں اور دوسرے سال ہم تمہارے معبود کی عبادت کر لیا کریں گے، ان کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی (قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ. لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ...) اس طرح کی تجویزیں مختلف اوقات میں پیش ہوتی رہتیں. جس کا تقاضا یہ تھا کہ ایک دفعہ دوٹوک جواب دے کر انکی اسطرح کی امیدیں ختم کردی جائیں.

چنانچہ یہ سورت کسی طرح کی مذہبی رواداری اور مداہنت کی تلقین نہیں کرتی. جیسا کہ آج کل بعض روشن خیالوں کا تصور ہے. بلکہ کفار اور کفر کے معبودوں سے قطعی براءت وبیزاری کا اعلان ہے، اور یہ کہ کفر وإسلام دو الگ الگ نظریات ہیں جو باہم کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے. اور قیامت تک کے مسلمانوں کو تعلیم ہے کہ دینِ کفر جہاں اور جس شکل میں بھی کیوں نہ ہو اس سے قول وعمل میں براءت کرنا چاہیے، اور کفر وشرک سے یہ براءت إیمان کی بنیاد، اور کلمہ توحید (لاإلٰہ إلا اللہ) کا پہلا حصہ ہے، جس کا بیان رب العزت نے اس انداز سے فرمایا: (وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُوْلاً أَنِ اعْبُدُوْا االلهَ وَاجْتَنِبُوْا الطَّاغُوْتَ) (اور یقیناً ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجا کہ اللہ کی

عبادت کرو اور طاغوت (غیر اللہ) سے بچو)، اس آیت میں اللہ تعالی کی عبادت کے ساتھ ساتھ طاغوت سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے. جو کہ ایمان کی بنیادی شرط ہے، اور طاغوت ہر وہ چیز ہے جس کی اللہ کے سوا عبادت، اطاعت، یا اتباع کی جاتی ہو.

تفسیر:

(قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْن) (کہہ دو کہ اے کافرو) یہ خطاب جیسے رسول اللہ ﷺ کے لیے ہے ایسے ہی ہر مسلمان کے لیے ہے کہ وہ دینِ کفر اور کفار سے براءت کا اعلان کرے. کفر کا لفظی معنی انکار کرنے اور نہ ماننے کے ہیں. اور مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی وحی کا انکار کیا. اور کفر کا لفظ شرک سے زیادہ عام ہے. جس میں کیمونسٹ و ملحد وغیرہ بھی شامل ہیں.

(لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ) (میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو) اس میں وہ تمام معبود شامل ہیں جن کی دنیا بھر کے کافر و مشرک عبادت کرتے رہے ہیں. جن میں اللہ تعالی کی ذات بھی شامل ہے. لیکن چونکہ مشرکین اللہ کی عبادت میں دوسروں کو شریک کرتے تھے. اس لیے اُن کی اس عبادت کا کوئی اعتبار نہیں. اور توحید پرست لوگ ایسی عبادت سے براءت کا اظہار کرتے ہیں. (وَمَا أُمِرُوْا إِلاَّ لِيَعْبُدُوْا اللهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ)، جس سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ ایمان جب تک اللہ کے لیے خالص نہ ہو تو ایسا ایمان غیر معتبر اور نا قابل قبول ہے، جیسا کہ حدیثِ قدسی میں إرشاد ہے: (جس نے اپنے عمل میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کر لیا تو میں اسے اور اسکے اس شرک کو ترک کر دیتا ہوں.

(وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَا أَعْبُد) (اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں) یعنی جن صفات سے متصف معبود کی میں عبادت کرتا ہوں تم اپنے شرک پر قائم رہتے ہوے اُس معبود کی عبادت کرنے والے نہیں ہو. جو ہر عیب، کمزوری، نقص، اور غلطی سے پاک ہے، جسکی ذات و صفات اور اختیارات میں کوئی شریک نہیں. جو دعائیں سنتا ہے، نفع و نقصان اور قسمتوں کے بناؤ و بگاڑ کا وہی تنہا مالک ہے. جبکہ تمہارے خیال میں اس کی صفات و اختیارات اور حاجت روائی و مشکل کشائی میں اور بھی شریک ہیں، نفع و نقصان کے دوسرے بھی مالک ہیں.

(وَلاَ أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ) (اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے) آیت نمبر (۲) میں اس بات کا بیان تھا کہ میں اس کی عبادت نہیں کرتا جسکی تم اب عبادت کرتے ہو یا آئندہ کروگے. جبکہ اس آیت میں یہ بیان ہو رہا ہے کہ میں اس کی عبادت نہیں کروں گا جسکی تم عبادت کرتے رہے ہو. کیونکہ کافروں کے معبودوں میں ہمیشہ ردوبدل اور حذف و اضافہ ہوتا رہتا ہے.

(وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَا أَعْبُدُ) (اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں) یہاں وہی الفاظ دہرائے گئے ہیں جو آیت نمبر (۳) میں ہیں. بعض مفسرین کے ہاں یہ الفاظ دہرانے کا مقصد تاکید کرنا ہے، مزید یہ کہ اہلِ إیمان کا معبود ہمیشہ ایک ہی رہتا ہے. جو ازل سے ابد تک ہے، اس لیے اس معبود سے متعلقہ جملہ انہی الفاظ سے دہرایا گیا.

(لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ) (تمہارے لیے تمہارا دین. اور میرے لیے میرا دین) یعنی میں تمہارے معبودوں کی عبادت نہیں کرتا اور تم میرے معبود کی، لہٰذا ہمارا دین ایک دوسرے سے الگ ہے، میں تمہارے دین سے بری ہوں، اور تم میرے دین سے بری ہو، چنانچہ اس آیت میں کسی مذھبی رواداری کا پیغام نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے کفر اور کفار سے براءت و بیزاری کا اعلان ہے، اسی طرح کا مضمون سورۃ قصص میں ان الفاظ سے آیا ہے: (لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ) (ہمارے لیے ہمارے عمل اور تمہارے لیے تمہارے عمل)، جس سے دوسروں کے عمل کو سہارا بنانے اور پیر زادگی، سیّد زادگی کی جڑ کٹتی ہے، کہ ہر انسان کا عمل اس کے ساتھ ہے، نیکی کا اجر اس کے لیے، اور

برائی کا وبال اسی پر ہے، اولادوں یا آنے والی نسلوں کا اس میں کچھ حصہ نہیں، صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا: (اے محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ عمل کرو، کیونکہ میں اللہ تعالی کے ہاں تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا، اے رسول اللہ کی پھوپھی صفیہ عمل کرو کیونکہ میں اللہ تعالی کے ہاں تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا، اے رسول اللہ ﷺ کے چچا عباس عمل کرو کیونکہ میں اللہ تعالی کے ہاں تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا.

مزید ارشادِ باری تعالی ہے: (قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْ إِبْرَاهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهُ إِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءَاؤُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ االلهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَداً حَتَّى تُؤْمِنُوْا بِاالله وَحْدَهُ) (اے مسلمانو) تمہارے لیے إبراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں میں بہترین نمونہ ہے جب انہوں نے اپنی (مشرک) قوم سے کہا: ہم تم سے بری ہیں اور جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو. ہمارا تم سے بائیکاٹ ہے، اور ہماری تم سے کھلم کھلا دشمنی ہے جب تک تم ایک اللہ پر ایمان نہ لاؤ

اٰیَاتُهَا 3	108 سُوْرَةُ الْكَوْثَرِ مَكِّيَّةٌ 15	رُكُوْعُهَا 1

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّآ ⑥	اَعْطَيْنٰكَ	الْكَوْثَرَ ①
بے شک ہم نے	ہم نے عطا کی آپ کو	کوثر

فَصَلِّ	لِرَبِّكَ ①	وَ	انْحَرْ ②
تو آپ نماز پڑھیں	اپنے رب کے لیے	اور	قربانی کریں

اِنَّ ③	شَانِئَكَ	هُوَ الْاَبْتَرُ ③
بے شک	آپکا دشمن	ہی لاولد (بے نام ونشان) رہے گا

وجہ تسمیہ: اس کا نام پہلی آیت میں لفظ کوثر سے لیا گیا ہے، اس کا دوسرا نام: سورۃ النحر بھی ہے.

زمانہ نزول: جمہور مفسرین کا قول ہے کہ یہ سورت مکی ہے، یہی قول ابن عباس، ابن عمر، ابن الزبیر اور حضرت عائشہ کا ہے. لیکن حسن بصری اور بعض دوسرے مفسرین اسے مدنی قرار دیتے ہیں. جس کی دلیل صحیح مسلم میں انسؓ بن مالک کی وہ حدیث ہے جس میں فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان موجود تھے کہ آپ پر اونگھ طاری ہوئی. پھر آپ نے مسکراتے ہوئے سر مبارک اٹھایا اور فرمایا: اس وقت میرے اوپر ایک سورت نازل ہوئی ہے، پھر آپ ﷺ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر سورہ کوثر کی تلاوت فرمائی. ان دونوں اقوال کی یہ توجیہ ہے کہ کئی ایک سورتیں ایسی ہیں جو اگرچہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں، لیکن مدینہ نبویہ میں کسی مناسبت پر اسے دوبارہ نازل کیا گیا، یا اسی کی طرف توجہ دلائی گئی، لیکن اصل نزول مکہ میں ہی ہے.

تاریخی پس منظر: جب رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کے خلاف دشمنی انتہاء کو پہنچ چکی، اور انہیں شدید مشکلات کا سامنا تھا، پھر یہ کہ کسی خاطر خواہ کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے تھے. اس طرح کے پر آشوب حالات میں اللہ تعالی آپ ﷺ کو تسلی دینے کے لیے وقتاً فوقتاً ایسی سورتیں اور آیات نازل فرماتا رہتا جن میں آپ ﷺ کو حوصلہ دینا اور ہمت بندھانا مقصود تھا، ایسے ہی حالات میں سورہ الضحی، سورہ الم نشرح اور سورہ الکوثر نازل ہوئیں. کفارِ قریش کا پروپیگنڈا تھا کہ (بتر محمدٌ منّا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ساری قوم سے کٹ کر بے سہارا و بے یار و مددگار ہو گئے ہیں، مزید یہ کہ آپ ﷺ کے بیٹے قاسم کے بعد دوسرے بیٹے عبداللہ کی وفات ہوئی تو ابو جہل، ابو لہب اور بعض دوسرے مشرکین نے کہا: محمد ابتر ہے، اس کا کوئی بیٹا نہیں جو اس کا قائم مقام بنے، جب یہ مر جائیں گے تو دنیا سے اس کا نام بھی مٹ جائے گا، تو اِن پریشان کن حالات میں اس سورت میں آپ ﷺ کو الکوثر کی خوشخبری دینے کے ساتھ ساتھ یہ فیصلہ بھی سنایا گیا کہ آپ کی مخالفت کرنے والوں کی ہی جڑ کٹنے والی ہے.

تفسیر:

(إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ) (ہم نے تمہیں الکوثر عطا کیا) الکوثر سے مراد (الخَيْرُ الْكَثِير) بے انتہا خیر و بھلائی اور دنیا و آخرت کی نعمتوں کی کثرت ہے، جس میں نبوت و رسالت، علم و حکمت، توحید و ایمان اور اخلاق و کردار کی وہ عظیم نعمتیں ہیں جو آپ کو عطا کی گئیں، اسلام کے اس عالم گیر دین کی نعمت جسے رہتی دنیا کے لیے پوری روے زمین پر پھیلنا اور غالب آنا تھا، جس دینِ حق کا غلبہ آپ ﷺ نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں ہی دیکھ لیا، اور آپ ﷺ کے ہاتھوں وہ جماعت تیار ہوئی جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی، اولاد نرینہ کی وفات پر دشمن تو سمجھتے تھے کہ آپ کا نام و نشان مٹ جائے گا، لیکن اللہ تعالی نے آپ ﷺ کا نام اور ذکر کچھ اس انداز سے بلند کیا کہ جسے قیامت تک کے

لیے دنیا کے گوشے گوشے میں بلند ہوتے رہنا ہے، آپ ﷺ کو وہ روحانی اولاد عطا کی جس نے روئے زمین پر آپ کا نام روشن کر دیا، بلکہ آپ ﷺ کی ایک ہی صاحبزادی فاطمہ رضی اللہ عنہا سے جسمانی اولاد کا بھی ایسا سلسلہ چلایا کہ جو دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے.

ان دنیوی نعمتوں کے علاوہ آخرت کی بے بہا اور حقیقی ودائمی نعمتیں ہیں جو اللہ تعالی آپ ﷺ کو عطا فرمانے والے ہیں، جن کا وعدہ ان الفاظ سے کیا ہے: (وَلَلآخِرَةُ خَيْرٌ لَكَ مِنَ الأُوْلَى . وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضَى) (یقیناً تمہارے لیے آخرت دنیا سے بہتر ہے. اور تمہارا رب تمہیں بہت انعام دے گا حتی کہ آپ خوش ہو جاؤگے)، انہیں نعمتوں میں سے مقامِ محمود (شفاعتِ کبری)، لواء الحمد (اللہ کی تعریفوں کا وہ جھنڈا جس کے نیچے تمام انبیاء ہونگے)، سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھلنا، جنت میں سب سے اعلی مقام الوسیلہ والفضیلۃ پا لینے کے علاوہ حوض کوثر اور نہرِ کوثر ہے جس کے متعلق (۵۰) سے زیادہ صحابہ سے مروی متواتر وبکثرت احادیث ہیں جن میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ صحیح بخاری ومسلم کی مختلف احادیث میں ہے کہ یہ وہ حوض ہے جو روزِ قیامت اس وقت آپ کو عطا ہوگا جب ہر شخص پیاس سے نڈھال ہو رہا ہوگا. آپ اس حوض پر سب سے پہلے پہنچیں گے. اور اپنے دستِ مبارک سے قرآن وسنت کی اتباع کرنے والوں کو پانی پلائیں گے. ایک بار اس کا پانی پینے کے بعد کبھی پیاس نہ لگے گی. اس حوض کی وسعت ایلہ (فلسطین کی بندرگاہ) سے عدن (جنوبی یمن کی بندرگاہ) تک ہے، اس کا پانی دودھ سے زیاد سفید، برف سے زیادہ ٹھنڈا اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا، اس کی تہہ کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار ہوگی، اس کے جام آسمان کے ستاروں کی مانند بکثرت ہوں گے۔ اور اسے جنت کی نہرِ کوثر سے سیراب کیا جائے گا، جو نہرِ معراج کی رات آپ کو دکھائی گئی، اس کے کناروں پر تراشے ہوئے ہیروں موتیوں کے قبے بنے ہوئے تھے.

دین میں نئے کام (بدعات) ایجاد کرنے والوں کے لیے لمحہ فکر: بخاری ومسلم کی متعدد روایات میں ہے کہ جبکہ آپ ﷺ اپنے دستِ مبارک سے اپنی امت کے لوگوں کو پانی پلا رہے ہونگے، آپ دیکھیں گے کہ کچھ لوگوں کو حوض سے ہٹایا جا رہا ہے، آپ ﷺ فرمائیں گے : یہ میری امت کے لوگ ہیں، انہیں آنے دو۔ تو آپ ﷺ سے کہا جائے گا کہ آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے بعد انہوں نے کیا کیا بدعات ایجاد کیں۔ تو اس پر آپ بھی فرمائیں گے: میرے بعد دین بدلنے والوں کو دفع ودور کر دو.

(فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ) (پس تم اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو)، نماز سے مراد ہر نماز ہے، اور خصوصاً پنجگانہ فرض نمازیں ہیں، اور (نحر) سے مراد ذبح کرنا ہے، حضرت علیؓ اور بعض سلف صالحین کا فرمان ہے کہ اس سے مراد : نماز میں دائیاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر سینے پر باندھنا ہے. کیونکہ لغت عربی میں (نحر) سینہ کو کہتے ہیں۔ جس کا معنی یہ ہوا کہ نماز پڑھتے ہوئے ہاتھ سینے پر رکھو. بعض مفسرین کہتے ہیں کہ : اس سے مراد : بقر عید کی نماز پڑھنا اور اس کے بعد قربانی کرنا ہے. یہ سبھی اقوال بجا اور صحیح ہیں۔ مزید یہ کہ سورت کے سیاق وسباق سے اس آیت کی مناسبت یہ ہے کہ جب اللہ تعالی نے آپ ﷺ کو دنیا وآخرت کی خیر وبھلائیاں عطا فرمائیں، تو یہ حکم ملا کہ اپنے رب کا شکر ادا کرتے ہوئے اسی کے لیے نماز پڑھو اور اسی کے لیے قربانی کرو. مشرکین کے برعکس جو اپنے خود ساختہ معبودوں کی عبادت کرتے اور انہی کے لیے ذبح کرتے اور بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ سورۃ انعام میں اسی بات کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: (قُلْ إِنَّ صَلاَتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِيْن . لاَ شَرِيْكَ لَهُ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْن) (کہہ دو کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اُس اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے، اور میں سب سے پہلا سرِ اطاعت جھکانے والا ہوں.

درسِ توحید: سورۃ الکوثر اور اِنعام کی دونوں آیتوں میں جس بات کی بنیادی طور پر تعلیم دی جا رہی ہے وہ : عبادت کو اللہ کے لیے خالص کرنا ہے، جس میں کسی طرح کے کا عمل دخل نہ ہو. کیونکہ شرک ایسا گھناؤنا جرم ہے کہ جس کے ساتھ ہر عمل برباد ہو جاتا ہے.

اور پھر نماز کے ساتھ ہی ذبح کا حکم دیے کر یہ واضح کر دیا کہ جس طرح نماز صرف اللہ کے لیے ہوتی ہے۔ کسی غیر اللہ کے لیے نماز پڑھنا شرک ہے، اسی طرح ذبح بھی صرف اللہ ہی کے لیے ہونا چاہیے۔ غیر اللہ کے لیے ذبح کرنا بھی شرکِ اکبر ہے، صحیح مسلم میں سیدنا علیؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں: (اللہ کی لعنت ہو ایسے شخص پر جو غیر اللہ کے لیے (یا اس کے نام پر) ذبح کرتا ہے)، اور مسند احمد کی صحیح حدیث میں آپ نے ایسے شخص کے بارے ذکر فرمایا جو صرف ایک مکھی غیر اللہ کے لیے نذرانہ چڑھانے کی وجہ سے جہنم واصل ہوگیا، جس میں: آستانوں، درگاہوں، جنات وغیرہ: غیر اللہ کے نام پر یا اُن کے لیے ذبح کرنے والوں کے لیے مقامِ عبرت ہے، اِن احادیث سے وہ اپنا انجام بھی معلوم کر لیں.

(إِنَّ شَانِئَکَ) (بیشک تمہارا دشمن) لفظ (شَانِء) انتہائی بغض وعداوت و دشمنی کے لیے استعمال ہوتا ہے. یہی لفظ قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ اس طرح سے آیا ہے: (وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَئَانُ قَوْمٍ عَلَى أَنْ لاَّ تَعْدِلُوْا) (کسی قوم کی عداوت تمہیں اس بات پر امادہ نہ کر دے کہ تم انصاف نہ کرو

(هُوَ الأَبْتَرُ) (وہی جڑ کٹا ہے) (ابتر) کا مفہوم بہت وسیع ہے، ایک حدیث میں ہے: (ہر اہمیت رکھنے والا کام اگر اللہ کی حمد کے بغیر شروع کیا جائے وہ ابتر ہے) یعنی اس میں کوئی خیر نہیں، ذرائع ووسائل سے محروم اور نامراد آدمی کو بھی ابتر کہا جاتا ہے، بے یار ومددگار شخص کو بھی ابتر کہا جاتا ہے، جس آدمی کی کوئی اولادِ نرینہ نہ ہو یا باقی نہ رہی ہو تو اس کے لیے بھی ابتر کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اس کی نسل باقی نہیں رہتی اور نام کٹ جاتا ہے، اسی طرح کے معانی میں کفارِ قریش آپ ﷺ کے لیے ابتر کا لفظ استعمال کرتے، اس پر اللہ تعالی نے فرمایا: ابتر تم نہیں بلکہ تمہارے یہ دشمن ہی ابتر ہونے والے ہیں، پورے عرب میں یہ نامور لوگ، جو کعبہ کے متولی، حج کی سرپرستی کرنے والے، جن کی مال ودولت کے چرچے تھے، ہر جگہ ان کے اعوان وانصار، جنگ خندق سنہء (5ھ) میں یہودیوں اور مختلف قبائل عرب سے (10) ہزار کا جمّ غفیر لا کر مدینہ کا محاصرہ کرنے والے ایسے ابتر ہوے کہ فتح مکہ سنہء (8ھ) میں ان کا کوئی یار ومددگار نہ تھا، اور بے بسی کی حالت میں ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئے، ربِ ذوالجلال کی یہ پیشین گوئی صرف چند سال میں ہی اس طرح پوری ہوئی کہ:

(1) ملتِ ابو جہل نیست ونابود ہو گئی، وہ ایسے بے نام ونشان ہوئے کہ دنیا میں اُن کا کوئی نام لیوا باقی نہ رہا، اُن کی اولاد میں سے جو زندہ بھی رہے وہ اپنی نسبت اسلافِ کفر سے کرنے کو تیار نہ تھے، لہٰذا کسی کو ابو جہلی یا ابولہبی کی نسبت سے نہ دیکھ پائیں گے، جبکہ ملتِ رسولِ ہاشمی زندہ وپائندہ ہے، آپ ﷺ کی آلِ مطہرہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں ہے، جن پر درود وسلام بھیجنا ہر مسلمان کے دینی شعائر میں سے ہے، اور نہ کہ صرف آپ ﷺ بلکہ آپ کے صحابہ سے انتساب کو بھی باعث سعادت وشرف سمجھتے ہوئے: ہاشمی، علوی، حسینی، عباسی اور صدیقی کہلاتے ہیں. (2) ابو جہل کا دینِ کفر بھی مٹ گیا، پورا جزیرہ عرب آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں ہی دینِ اسلام میں داخل ہوگیا، اور صرف پہلی صدی ہجری کے اختتام تک اسلام کے جیالے چین وفرانس کو اسلام کا پیغام سنا رہے تھے، جس سے اللہ تعالی کا وعدہ: (هُوَ الَّذِيْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدَى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ) (اسی (اللہ کی) ذات نے اپنے رسول کو ہدایت ودینِ حق کے بھیجا تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دیے)، اور رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی (روئے زمین پر کوئی مٹی پتھر کا گھر ہو یا خیمے کا، مگر کلمہ اسلام اس میں ضرور داخل ہو کر رہے گا) حقیقت بن گئی.

اٰیَاتُهَا 7 | 107 سُوْرَةُ الْمَاعُوْنِ مَكِّيَّةٌ 17 | رُكُوْعُهَا 1

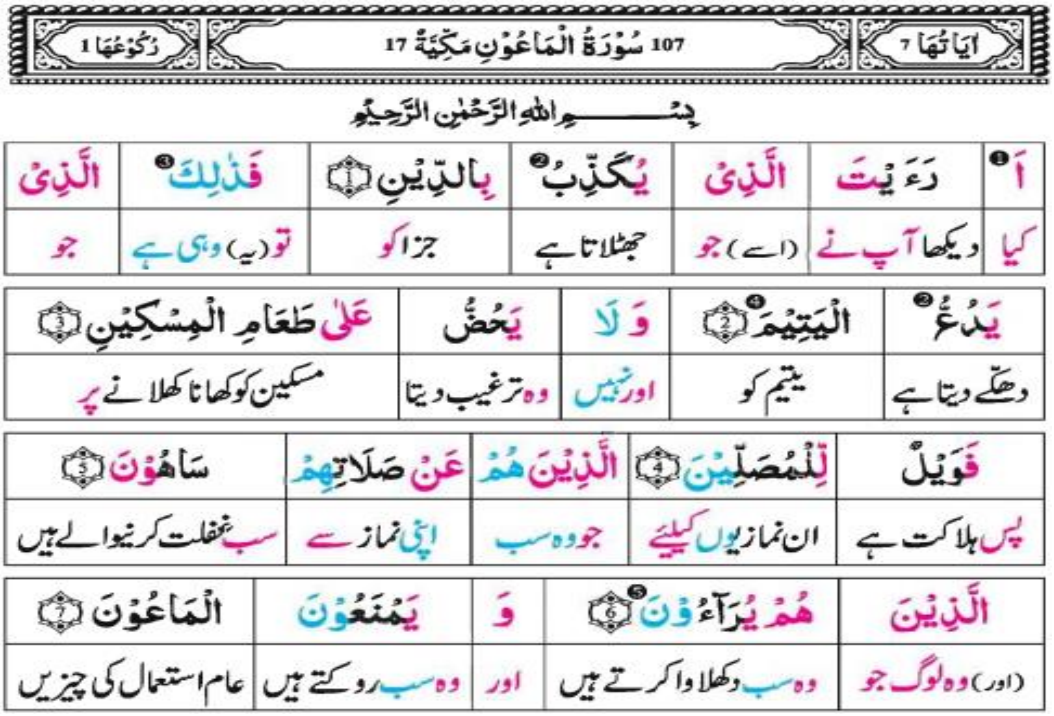

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

أَ	رَءَيْتَ	الَّذِیْ	يُكَذِّبُ	بِالدِّيْنِ ﴿1﴾	فَذٰلِكَ	الَّذِیْ
کیا	دیکھا آپ نے	(اسے) جو	جھٹلاتا ہے	جزا کو	تو (یہ) وہی ہے	جو

يَدُعُّ	الْيَتِيْمَ ﴿2﴾	وَلَا	يَحُضُّ	عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿3﴾
دھکے دیتا ہے	یتیم کو	اور نہیں	وہ ترغیب دیتا	مسکین کو کھانا کھلانے پر

فَوَيْلٌ	لِّلْمُصَلِّيْنَ ﴿4﴾	الَّذِيْنَ هُمْ	عَنْ صَلَاتِهِمْ	سَاهُوْنَ ﴿5﴾
پس ہلاکت ہے	ان نمازیوں کیلئے	جو وہ سب	اپنی نماز سے	سب غفلت کرنیوالے ہیں

الَّذِيْنَ	هُمْ يُرَآءُوْنَ ﴿6﴾	وَ	يَمْنَعُوْنَ	الْمَاعُوْنَ ﴿7﴾
(اور) وہ لوگ جو	وہ سب دکھلاوا کرتے ہیں	اور	وہ سب روکتے ہیں	عام استعمال کی چیزیں

سورت کے نام اور وجہ تسمیہ : اس سورت کو سورۃ الدین، سورۃ ارایت، اور سورۃ الیتیم بھی کہتے ہیں. اس کا نام سورت کے آخری لفظ (الماعون) سے لیا گیا ہے.

زمانہ نزول: اس کے مکی یا مدنی ہونے کے بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے، بعض علماء نے اس کے موضوع کے اعتبار سے اس کے مدنی ہونے کی ترجیح کی ہے، کیونکہ اس میں ان منافقین کا ذکر آیا ہے جو نمازیں دکھلاوے ریاکاری کے لیے ادا کرتے تھے، اور یہ صورتِ حال صرف مدینہ منورۃ میں پیش آئی، مکہ مکرمہ میں تو مسلمانوں کو نمازیں چھپ چھپا کر پڑھنا پڑتی تھیں. لیکن یہ بات اس کے مدنی ہونے کی کوئی حتمی دلیل نہیں، کیونکہ کسی آیت کا نزول مستقبل میں پیش آنے والے حالات کے بیان میں بھی ہو سکتا ہے. جیسا کہ قرآنِ کریم کی متعدد آیات میں موجود ہے.

موضوع و لبّ لباب: اس سورت میں دو گروہوں کا بیان ہوا ہے: سورت کی ابتداء میں اُن کفار کا بیان ہے جو علانیۃً آخرت کو جھٹلاتے ہیں، اور آخری چار آیتوں میں اُن منافقین کا بیان ہے جو آخرت پر یقین نہ ہونے کی وجہ سے کسی ثواب وعقاب کا تصور نہیں رکھتے. جس سے معلوم ہوا کہ روزِ قیامت اور جزاوسزا کا عقیدہ انسان میں مضبوط اور پاکیزہ کردار پیدا کرتا ہے. اور آخرت پر ایمان نہ لانے سے انسان میں کس طرح کی دینی واخلاقی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں.

تفسیر :

(أَرَأَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ) یہ خطاب رسول اللہ ﷺ کے بعد ہر قرآن کی تلاوت کرنے سننے والے کے لیے.

سوال تعجب کے انداز میں ہے. جس کا مقصد پڑھنے سننے والے کو اس بات پر غور وفکر کی دعوت دینا ہے کہ آخرت کی جزاوسزا کا انکار آدمی میں کس قسم کا کردار پیدا کرتا ہے، اور اس عقیدے کو جھٹلانے والے کیسے لوگ ہوتے ہیں، تاکہ وہ ایمان بالآخر کی اخلاقی اہمیت سمجھنے کی کوشش کرے.

ابتدائی آیات کا تعلق رؤیت علم و معرفت کے معنی سے ہے، جس کا مطلب سمجھنا اور غور کرنا ہے، اور معنی یہ کہ تم نے غور کیا اس شخص کے حال پر جو جزائے اعمال کی تکذیب کرتا ہے، جبکہ آخری آیات میں رؤیت آنکھوں کی بصارت ہے کیونکہ منافقین کی یہ حالت ہر دیکھنے والا اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے.

اکثر مفسرین کے نزدیک دین سے مراد آخرت کا حساب وجزا ہے. اور ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس سے مراد دینِ اسلام لی ہے، اور دونوں معنی ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں، مقصد یہ کہ اسلام اور آخرت پر یقین ایسی سیرت و کردار پیدا کرتا ہے جو اس پر ایمان نہ لانے والوں میں نہیں پائی جاتی. جس سے ایمانِ بالآخرۃ کی اخلاقی اہمیت واضح ہوتی ہے.

(فَذَلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ) حرف (ف) یہاں پورے جملے کی حیثیت رکھتا ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ انکارِ آخرت کی وجہ سے وہ ایسا شخص ہے جو مذکورہ قباحتوں میں مبتلا ہے. اور معنی یہ کہ جو شخص بخیل ہونے کے ساتھ ساتھ قیامت کا بھی منکر ہو تو ایسے شخص سے کس خیر و بھلائی کی امید کی جا سکتی ہے، اور ایسا شخص یتیم و نادار اور بے سہارا لوگوں کے ساتھ کیوں کر حسنِ سلوک کر سکتا ہے؟ یتیم کے ساتھ تو وہی اچھا سلوک کرے گا جس کے دل میں مال کی بجائے انسانی قدروں اور اخلاقی ضابطوں کی اہمیت ہو، اور اپنے نیک اعمال کا بدلہ قیامت کے روز پانے کی امید رکھتا ہو. جبکہ قیامت کا منکر شخص جیسے چاہے ظلم و ستم ڈھائے، یتیموں بے بسوں کا حق کھائے، اُن کی پائی ہوئی وراثت ہڑپ کر جائے، اور اگر وہ رحم کی اپیل لے کر آئیں تو دھتکار دیا جائے، کیونکہ :(إِنَّهُمْ كَانُوْا لاَ يَرْجُوْنَ حِسَابًا) (انہیں کسی حساب وکتاب کی توقع ہی نہ تھی)، ماوردی کا اعلام النبوۃ میں نبی کریم ﷺ اور ابو جہل کے مابین یتیم بچے کے بارے واقعہ نقل کرنا.

(وَلاَ يَحُضُّ عَلَى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ) اور یتیم کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا، اور جو شخص کسی دوسرے کو ایسی بات نہ کہے وہ خود کہاں ایسا کرے گا؟ بعض مفسرین نے اس کا معنی یہ کیا ہے کہ (وہ مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اکساتا) یعنی جو کھانا مسکین کو دیا جاتا ہے وہ دینے والے کا کھانا نہیں بلکہ اُسی مسکین کا کھانا اور اس کا حق ہے جو دینے والا ادا کر رہا ہے، یہی سورہ ذاریات میں اس انداز سے بیان فرمائی گئی : (وَفِيْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ) (اور ان کے مالوں میں سائل و محروم کا حق ہے)، یہ بھی سابقہ اسباب پر مبنی ہے، کہ انسانیت پر نیکی واحسان کے جذبہ سے محروم اور روزِ جزا کا منکر غریبوں مسکینوں کو کھلانے ترغیب نہیں دے سکتا.

آخرت کے منکر میں یہی دو خرابیاں پیدا نہیں ہوتیں. بلکہ وہ بے شمار خرابیوں اور قباحتوں کا شکار ہوتا ہے، ان دو کا ذکر بطور مثال ہے، جن کو ہر شریف الطبع و سلیم الفطرت شخص تسلیم کرتا ہے کہ یہ بہت گری ہوئی اور کمینی حرکتیں ہیں. اسی مضمون کا بیان سورۃ الفجر میں اِن الفاظ کے ساتھ کیا گیا ہے: (كَلاَّ بَل لاَّ تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ. وَلاَ تَحَاضُّوْنَ عَلَى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ . وَتَأْكُلُوْنَ التُّرَاثَ أَكْلاً لَمًّا) (یہ بات نہیں (سابقہ آیات میں مذکور) بلکہ تم یتیم کی خاطر داری نہیں کرتے. اور محتاج کو کھانا کھلانے اپنے تئیں یا دوسروں کو ترغیب نہیں دلاتے. اور وراثت کا سارا مال ہڑپ کر جاتے ہو.

(فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّيْنَ) ویل کے معنی تباہی و بربادی، اور جہنم کی وادی جس سے جہنم خود بھی پناہ مانگتی ہے .

(الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلاَتِهِمْ سَاهُوْنَ) انس بن مالک اور عطاء بن دینار فرماتے ہیں: اللہ تعالی کا شکر ہے کہ جس نے (عَنْ صَلاَتِهِمْ سَاهُوْنَ) (نماز سے غافل) فرمایا، نہ کہ : فی صلاتہم ساہون (نماز میں غافل)، کیونکہ ہم نماز میں بھولتے تو ضرور ہیں لیکن غافل نہیں ہیں، اس لیے ہمارا شمار اُن منافقوں میں نہیں ہے. کیونکہ دورانِ نماز بھول جانا نفاق تو درکنار گناہ بھی نہیں ہے، بلکہ سرے سے کوئی قابلِ گرفت عیب نہیں، سجدہء سہو سے اس کی تلافی ہو جاتی ہے.

جبکہ نماز سے غافل ایسے لوگ ہیں جو نہ صرف مسلمان کہلاتے بلکہ کسی حد تک نماز بھی پڑھتے ہیں، لیکن اس کی پابندی نہیں کرتے، نماز پڑھی نہ پڑھی دونوں ان کی نگاہ میں برابر ہے، اگر بعض نمازیں ادا کر لیں تو دوسری چھوڑ دیں، اور نماز کے اوقات، اس میں خشوع وخضوع، إخلاص وسنت کی مطابقت، اور باجماعت ادائیگی کا کوئی اہتمام نہیں، نماز کا وقت آتا ہے تو انہیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا، مؤذن کی آواز کی آواز پر انہیں خیال تک بھی نہیں آتا کہ یہ کس کی طرف سے پکار رہا ہے؟ کس کو پکار رہا ہے؟ اور کس کے لیے پکار رہا ہے؟ اور یہی آخرت پر ایمان نہ ہونے کی علامت ہے، روزِ جزا کے انکار کے سیاق وسباق میں ایسے لوگوں کا ذکر کرنے کا مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ نماز میں وہی شخص کوتاہی کرتا ہے جو آخرت کے حساب وکتاب پر یقین نہیں رکھتا.

نماز میں دوسرے خیالات کا آجانا بڑی بات نہیں، یہی بشریت کا تقاضا ہے، لیکن نماز کی طرف متوجہ ہی نہ ہونا اور دوسری باتیں ہی سوچتے رہنا، نماز کو جلدی جلدی سر سے اتار کر چل دینا بھی نماز میں غفلت ہے، ایسا کرنے والا دراصل وزرش (Exercise) کر رہا ہوتا ہے، صحیح بخاری ومسلم کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے تین بار فرمایا: (یہ منافق کی نماز ہے، عصر کے وقت بیٹھا سورج کو دیکھتا رہتا ہے. یہاں تک کہ جب وہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہوتا ہے (یعنی غروب ہونے والا ہوتا ہے) تو اُٹھ کر چار ٹھونگیں مار لیتا ہے جن میں اللہ کو کم ہی یاد کرتا ہے.

(الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاءُوْنَ) یہ آیت سابقہ آیت سے متعلق بھی ہو سکتی ہے جیسا کہ اکثر مفسرین کا قول ہے، اور مستقل جملہ بھی ہو سکتا ہے، سابقہ آیت سے متعلق ہونے کے اعتبار سے ابن عباسؓ کا فرمان ہے: اس سے مراد منافقین ہیں جو دکھلاوے کی نمازیں پڑھتے ہیں. کوئی دیکھنے والا ہو تو پڑھ لیتے ہیں ورنہ نہیں پڑھتے، جیسا کہ إرشادِ باری تعالی ہے: (وَإِذَا قَامُوْا إِلَى الصَّلاَةِ قَامُوْا كُسَالَى يُرَاءُ وْنَ النَّاسَ وَلاَ يَذْكُرُوْنَ اللهَ إِلاَّ قَلِيْلاً) (جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی اور کاہلی کے ساتھ، دکھلاوا کرتے ہوے اور اللہ کا ذکر تھوڑا ہی کرتے ہیں). مستقل جملہ ہونے کے اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اِن منافقوں کوئی عمل بھی خالص نیت سے نہیں ہوتا، بلکہ جو کچھ کرتے ہیں دوسروں کو دکھانے کے لیے کرتے ہیں، تاکہ ان کے کارِ خیر کا ڈھنڈورا پٹے، اور اس کا فائدہ کسی نہ کسی صورت میں دنیا میں ہی حاصل ہو جائے.

(وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ) لفظ (مَعن) کسی منفعت والی تھوڑی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے، بعض صحابہ وتابعین کے ہاں اس سے مراد زکاۃ ہے، کیونکہ وہ بھی اصل مال کے مقابلے میں صرف (2.5%) بہت تھوڑی ہے، جبکہ بعض دوسرے صحابہ وتابعین نے اس سے مراد گھریلو استعمال کی معمولی چیزیں لی ہیں، مثلاً: ڈول، ہنڈیا، کلہاڑی، ترازو، چھلنی وغیرہ، مطلب یہ کہ گھریلو استعمال کی معمولی چیزیں عاریتاً نہ دینا اور بخل وکنجوسی کرنا بھی آخرت پر ایمان نہ لانے والے لوگوں کی صفت ہے جو اخلاقاً ایک ذلیل اور کمینی حرکت ہے، کیونکہ ایسی چیزوں کا عام طور پر ہمسایوں میں لین دین رہتا ہے، اور سبھی کو کسی نہ کسی وقت ان کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے.

تفسیر سورۃ قریش Surah Al-Quraish

ایاتھا 4 — 106 سُوْرَۃُ قُرَیْشٍ مَکِّیَّۃٌ 29 — رکوعھا 1

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ﴿۱﴾	اٖلٰفِهِمْ	رِحْلَةَ	الشِّتَآءِ
قریش کے دل میں محبت ڈالنے کیلیے	انکے دل میں محبت ڈالنے (کیلیے)	سفر پر	سردی

وَ	الصَّیْفِ ﴿۲﴾	فَلْیَعْبُدُوْا	رَبَّ	هٰذَا الْبَیْتِ ﴿۳﴾
اور	گرمی کے	تو چاہیے کہ وہ سب عبادت کریں	رب کی	اس گھر کے

الَّذِیْٓ	اَطْعَمَهُمْ	مِّنْ جُوْعٍ	وَّ	اٰمَنَهُمْ	مِّنْ خَوْفٍ ﴿۴﴾
جس نے	کھانا دیا انہیں	بھوک سے (بچا کر)	اور	امن دیا انہیں	خوف سے (بچا کر)

تسمیہ: پہلی آیت میں مذکور لفظ (قریش) سے اس کا نام لیا گیا ہے.

زمانہ نزول: سوائے اکا دکّا کے سبھی مفسرین نے اسے مکی قرار دیا ہے. اور خود اس کے الفاظ بھی اس کے مکی ہونے کی گواہی دیتے ہیں، خصوصاً (رَبَّ هٰذَا الْبَيْت) (یعنی اسی گھر کے رب) کے الفاظ میں تو واضح طور پر مکی ہونے کا بیان ہے، بلکہ اس کا مضمون سابقہ سورہ الفیل سے بہت گہرا تعلق رکھتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نزول سورہ الفیل کے متصل بعد ہوا ہے. یہاں تک کہ حضرت اُبیّ بن کعب کے مصحف (قرآن) میں دونوں سورتیں ایک ہی سورت کے انداز سے لکھی ہوئیں تھیں، درمیان میں (بسم اللہ) نہیں تھی، لیکن علماء امت کا اجماع ہے کہ دونوں الگ الگ سورتیں ہیں، اور جن صحابہ سے متعلق اس سورت کو ایک ساتھ پڑھنے کا ذکر ہے، وہ ان کے موضوع کے اعتبار سے ہے.

تاریخی پسِ منظر :

قبیلہ قریش رسول اللہ ﷺ کے جد اعلی قُصَی بن کِلاب کے زمانے تک حجاز کے مختلف علاقوں میں منتشر تھا، قُصَی نے انہیں مکہ میں جمع کیا اور بیت اللہ کی سرپرستی کا منصب سنبھالا، حاجیوں کی خدمت کا بہترین انتظام کیا، جس وجہ سے عرب کے تمام علاقوں میں قریش کا اثر ورسوخ قائم ہو گیا، اس کے بعد آپ ﷺ کے دادا ہاشم بن عبد مناف بن قصی نے بین الاقوامی تجارت کی بنیاد رکھی، جس سے مکہ ایک بین الاقوامی مارکیٹ بن گیا، مختلف علاقوں سے آنے والے حجاج اپنے ساتھ سامان لاتے اور اسے مکہ میں فروخت کرکے یہاں کی منڈیوں میں شام و یمن سے آنے والا سامان خریدتے ، اس مقصد کے لیے ہاشم نے اپنے تینوں بھائیوں : عبد شمس، مطلب اور نوفل کو بھی شریک کیا، جنہوں نے مختلف ممالک سے تجارتی معاہدات کیے ، اور پھر عرب میں قریش کی مذہبی سیادت کی وجہ سے ان کے تجارتی قافلے بھی بغیر کسی خطرہ ورکاوٹ کے سفر کرتے، بلکہ راستے کے قبائل اُن سے وہ بھاری ٹیکس بھی وصول نہ کرتے جو دوسرے قافلوں سے وصول کرتے تھے. انہیں وجوہات سے ہاشم اور اس کے بھائیوں کو اصحاب الایلاف کہا جاتا ہے، یعنی اُلفت پیدا کرنے والے.

پھر مزید یہ کہ مختلف ممالک سے تجارتی تعلقات کی وجہ سے قریش کے اِن ممالک کی تہذیب وتمدن سے بھی بہرہ ور ہوئے، جس وجہ سے وہ عام عرب قبائل سے اپنی تہذیب وثقافت میں بھی فائق تھے، اسی ضمن مسند احمد میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: (قریش لوگوں کے لیڈر ہیں.

اور پھر قصہ اصحابِ فیل نے قریش کی عرب میں مزید دھاک بٹھادی، ابرھہ کے حبشی لشکر کی عبرتناک انداز سے تباہی سے عربوں کو یقین ہوگیا کہ قریش پر اللہ کا خاص فضل ہے، اور وہ اس کے حفظ وامان میں ہیں.

چنانچہ سورت کا موضوع ولب لباب یہ ہے کہ قریش پر اللہ نے اجتماع وامن آسودگی کے انعامات جتلاتے ہوئے انہیں توحید کا سبق دیا ہے، کہ جس گھر کی وجہ سے انہیں اس قدر نعمتیں مل رہی ہیں، انہیں چاہئے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں.

تفسیر :

(لِإِيْلاَفِ قُرَيْشٍ) (قریش کے مانوس ہونے کے سبب) اِیلاف لفظ اَلِفَ سے ہے، جس کے معنی الفت اور مانوسی کے ہیں، اور بکھرنے اور منتشر ہونے کے بعد مِل جانا ہے. اور ایلاف سے پہلے (لام) کے بارے مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ لام تعجب کے معنی میں ہے، یعنی قریش کا رویہ بڑا ہی قابلِ تعجب ہے، کہ وہ منتشر ہونے کے بعد اللہ کے فضل سے جمع ہوئے، اور اسی کے فضل اور پھر بیت اللہ کی وجہ سے انہیں روحانی سیادت اور مالی خوشحالی حاصل ہوئی، پھر بھی وہ اللہ کی بندگی سے روگردانی کرتے ہیں؟

(إِلفِهِمْ رِحْلَةَ الشَّتَاءِ وَالصَّيْفِ) (اُن کا مانوس ہونا گرمی اور سردی کے سفر سے) قریش کے تجارتی قافلے گرمی کے موسم میں شام و فلسطین کی طرف سفر کرتے کیونکہ وہ ٹھنڈے علاقے تھے، اور سردی میں جنوبِ عرب کے علاقے یمن کی طرف ان کے قافلے چلتے کیونکہ وہ نسبتاً گرم علاقہ تھا. اس آیت میں قریش کو اس نعمت کا احساس دلایا جارہا ہے کہ اُن کے یہ قافلے بغیر روک ٹوک اپنے تجارتی سامان کے ساتھ لمبے سفر طئے کرتے، جو محض اللہ کا فضل اور پھر بیت اللہ کی وجہ سے ہے، اسی لیے اگلی آیت میں اس نعمت کا شکر ادا کرتے ہوئے ایک اللہ کی عبادت کا حکم دیا جارہا ہے.

(فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ) (لہٰذا اُن کو چاہیے کہ اسی گھر کے رب کی عبادت کریں)، گھر سے مراد خانہ کعبہ ہے، یہاں قابلِ غور یہ بات ہے کہ براہِ راست اللہ کی عبادت کا حکم دینے کی بجائے خانہ کعبہ کے رب (اللہ تعالی) کی عبادت کا حکم دیا جارہا ہے، اور اس میں یہ راز ہے کہ خانہ کعبہ (بیت اللہ) کی وجہ سے انہیں جو سہولتیں حاصل ہو رہی تھیں، انہیں کسی طرح بھی اس کا انکار کرنا ممکن نہ تھا، خانہ کعبہ کی وجہ سے ہی انہیں عرب میں قیادت وسیادت اور عزت وتکریم حاصل ہوئی، اور پھر اسی گھر (بیت اللہ) کی طرف نسبت کی وجہ سے انہیں عرب میں امن وامان حاصل ہوا جس سے ان کی معاشی حالت بہتر ہوئی، بلکہ اسی گھر کے سایہ میں آنے کے بعد ان کے بکھرے ہوئے خاندانوں کو اجتماعی حیثیت حاصل ہوئی، تو اگر انہیں بیت اللہ کی بدولت اتنے بڑے انعامات حاصل ہو رہے ہیں تو پھر انہیں چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں.

یہاں یہ بھی قابلِ غور بات ہے کہ خانہ کعبہ اگرچہ اللہ کا گھر ہے، اور روئے زمین پر افضل واطہر خطہ ہے، اور اللہ تعالی نے اس میں دین ودنیا کی بہت سی خیر وبھلائیاں رکھ دی ہیں، لیکن پھر بھی اس گھر کی نہیں بلکہ اس گھر کے رب کی عبادت کا حکم دیا، جس میں اُن لوگوں کے

لیے بہت بڑا سبق ہے جو مختلف ذوات واشخاص میں کسی طرح کی کوئی فضیلت وبزرگی دیکھ کر اُنہیں یہ بزرگی عطا کرنے والے کی بجائے اُنہیں بزرگوں کی ہی عبادت شروع کر دیتے ہیں، اور یہی شیطان کا وہ ہتھکنڈہ ہے جس سے زمانہ قدیم سے وہ لوگوں کو گمراہ کرتا چلا آیا ہے، اسی بات کو نبی کریم ﷺ نے (غُلُوّ) کا نام دیتے ہوئے فرمایا: (إِيَّاكُمْ وَالْغُلُوّ ، فَإِنَّمَا أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ الْغُلُوُّ فِيْ الدِّيْن) (زیادتی سے بچو، کیونکہ تم سے پہلی قوموں کی ہلاکت دین میں زیادتی کی وجہ سے تھی.

(اَلَّذِيْ أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوْعٍ وَامَنَهُمْ مِنْ خَوْف) (جس نے انہیں بھوک سے بچا کر کھانا دیا، اور خوف سے بچا کر امن عطا کیا)، قریش مکہ میں آنے سے پہلے عرب کے مختلف علاقوں میں منتشر تھے، جہاں وہ بھوکوں مر رہے تھے، اللہ تعالی نے انہیں جمع کر کے مکہ میں لا بسایا، اور بے آب وگیا صحرا اور سنگلاخ پہاڑوں میں تازہ پھلوں کا رزق عطا کیا، جو ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کا مصداق ہے: (رَبِّ اجْعَلْ ہٰذَا بَلَداً آمِناً وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَات) (اے پرودگار، اس جگہ کو امن ولا شہر بنادے اور اس کے باشندوں کو پھلوں کا رزق عطا فرما.

اسلام سے قبل عرب نہ کہ صرف اخلاقی اور دینی ابدتری کا شکار تھے بلکہ سیاسی طور پر بھی بہت بری طرح بگاڑ کا شکار تھے، کسی بستی کو امن وامان حاصل نہ تھا، کوئی قافلہ اطمنان سے سفر نہ کر سکتا تھا، اور کسی شخص کی جان ومال محفوظ نہ تھے، اِن حالات میں قریش مکہ وہ لوگ تھے جنہیں اس طرح کے کوئی خطرات نہ تھے، اُن کے قافلے خیر وسلامتی سے اپنی منزلیں طئے کرتے، مکہ تو کیا بلکہ مکہ سے دور دراز علاقوں میں بھی کسی قریشی پر کوئی ہاتھ اٹھانے کی جرات نہ سکتا تھا، اور یہ بھی ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا نتیجہ ہے.

امن وامان کی یہ نعمت اس قدر اہم ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں اسے روزی پر بھی مقدم کیا ہے، کیونکہ امن وامان ہو تو روزی کی تنگی بھی محسوس نہیں ہوتی، جبکہ خزانوں کے ڈھیر بھی بدامنی میں بے کار بلکہ وبالِ جان ہوتے ہیں، امن وامان کی نعمت چھن جانے کی وجہ سے قوموں کی معیشت برباد ہو جاتی، اور ان کے ترقیاتی منصوبے ناکام ہو جاتے ہیں، ہنستے بستے گھر ویرانوں میں بدل جاتے، اور مسجد ومحراب خالی ہو جاتے ہیں. یہی وجہ ہے کہ اسلام نے توحید وایمان کے ساتھ ساتھ امن وامان کا نہایت اہتمام کیا ہے، اور ہر ممکن طریقہ سے اسے حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے، اور امن وامان کی خرابی کو سخت جرم قرار دیا ہے، ایک دن رسول اللہ ﷺ نے خانہ کعبہ پر نظر ڈالتے ہوئے فرمایا کہ اے کعبہ: اے کعبہ، تیری کس قدر عظمت ہے، اور تیری حرمت کس قدر عظیم ہے، لیکن جس ذات کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے ایک مسلمان کے مال وخون کی حرمت اللہ تعالی کے ہاں تم سے بھی بہت زیادہ ہے.

آیَاتُھَا 5 | 105 سُوْرَۃُ الْفِیْلِ مَکِّیَّۃٌ 19 | رُکُوْعُھَا 1

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلَمْ	تَرَ	كَيْفَ	فَعَلَ	رَبُّكَ
کیا نہیں	تو نے دیکھا	کیا	سلوک کیا	تیرے رب نے

بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ﴿1﴾	اَ	لَمْ يَجْعَلْ	كَيْدَهُمْ
ہاتھی والوں کے ساتھ	کیا	نہیں اس نے کر دیا	ان کی چال کو

فِيْ تَضْلِيْلٍ ﴿2﴾	وَ	اَرْسَلَ	عَلَيْهِمْ	طَيْرًا	اَبَابِيْلَ ﴿3﴾	تَرْمِيْهِمْ
بے کار میں	اور	بھیجے	ان پر	پرندے	جھنڈ کے جھنڈ	(جو) پھینکتے تھے ان پر

بِحِجَارَةٍ	مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿4﴾	فَجَعَلَهُمْ	كَعَصْفٍ	مَّاْكُوْلٍ ﴿5﴾
کنکریاں	کھنگر کی	پھر کر دیا انہیں	بھس کی طرح	کھائے ہوئے

سورت کا نام: پہلی آیت میں مذکور ہے.

زمانہ نزول: اس سورت کے مکی ہونے پر سبھی کا اتفاق ہے.

تاریخی پس منظر: سنہ 525ء میں حبشہ کی عیسائی سلطنت نے یمن پر حملہ کرکے وہاں حبشی حکومت قائم کر دی، جس کا بعد میں ابرھہ بن اشرم خود مختار حکمران بن گیا، یمن پر مکمل قبضہ کرنے کے بعد ابرھہ نے یمن کے دار الحکومت صنعاء میں القُلَّیس نامی عظیم الشان کلیسا تعمیر کروایا، اور عربوں میں منادی کروادی کہ لوگ بیت اللہ کی بجائے اس چرچ کا حج کریں. جس سے اس کا مقصد عربوں کو غصہ دلانا تھا تاکہ وہ کوئی ایسی کاروائی کریں جس سے اس کو مکہ پر حملہ کرنے اور کعبہ کو منہدم کرنے کا بہانہ مل سکے. چنانچہ اس اعلان سے غضبناک ہو کر ایک عربی نے کلیسا میں گھس کر قضاء حاجت کر ڈالی. اور بعض روایات میں ہے کہ قریش کے کچھ نوجوانوں نے اس کلیسا میں آگ لگادی تھی، جس پر ابرھہ نے قسم کھائی کہ اس وقت تک چین نہ لے گا جب تک کعبہ کو گرانہ دے.

اس کے بعد وہ سنہ 571ء میں (60) ہزار فوج اور (13) ہاتھی لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوا، راستہ کے بعض عرب قبائل نے اس کی مزاحمت کی لیکن انہوں نے شکست کھائی، مکہ سے تین میل قبل المغمّس نامی جگہ پہ ابرھہ نے پڑاؤ ڈالا، اور قریش کے بہت سے مویشی لوٹ لیے، جن میں رسول اللہ ﷺ کے دادا عبدالمطلب کے بھی (200) اونٹ تھے، اس کے بعد اس نے ایک ایلچی بھیج کر مکہ والوں پیغام دیا کہ میں تم سے لڑنے نہیں آیا ہوں، بلکہ اس گھر (کعبہ) کو گرانے آیا ہوں، ایلچی نے یہ پیغام مکہ کے سردار عبدالمطلب کو پہنچایا، جب عبدالمطلب ابرھہ کے پاس آیا تو وہ اسکی وجاہت سے متاثر ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کر عبدالمطلب کے پاس آ بیٹھا، اور پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ عبدالمطلب نے کہا کہ مجھے میرے اونٹ واپس کر دو، جس پر ابرھہ نے برہم ہو کر کہا: آپ اپنے اونٹوں کا مطالبہ کر رہے ہو، جبکہ یہ گھر جس کی وجہ سے تمہاری عزت وو قار ہے اس کی بات نہیں کرتے، عبدالمطلب نے کہا: (أَنَا رَبُّ الإِبِلِ. وَلِلْبَيْتِ رَبٌّ يَحْمِيْهِ) میں اونٹوں کا مالک ہوں، جبکہ اس گھر کا ایک رب ہے جو اس کی حفاظت کرے گا، یہ کہہ کر عبدالمطلب اٹھ کر چلے آئے، اور ابرھہ نے اُن کے

اونٹ انہیں واپس کر دیے. اور بعض دوسری روایات میں ہے کہ عبدالمطلب خود ابرھہ کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ تم جو بھی کچھ لینا چاہتے ہو لے لو لیکن کعبہ کو نہ گراو، لیکن ابرھہ نے کہا کہ ہم ضرور اسے گرا کر ہی جائیں گے. البتہ حقیقت یہ ہے کہ قریش میں ابرھہ کے اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہ تھی، اس لیے عبدالمطلب نے واپس آ کر قریش سے کہا کہ وہ اپنے بال بچوں کو لے کر پہاڑوں میں چلے جائیں، تاکہ خونریزی سے بچ جائیں.

پھر عبدالمطلب اور قریش کے سردار بیت میں آے، اور اپنے (360) بتوں کو بھلا کر صرف ایک اللہ سے فریادیں کرنے لگے، مؤرخین نے ان کے دعائیہ اشعار نقل کیے ہیں، جن کا مفہوم یہ ہے کہ: اے اللہ تو اپنے گھر کی حفاظت کر، اور اہلِ صلیب کے مقابلے انہیں غالب کر، اور ہم تیرے سوا اُن کے مقابلے میں کسی سے امید نہیں رکھتے .

یہ دعائیں مانگ کر وہ لوگ پہاڑوں میں نکل گئے، اور دوسرے روز ہی ابرھہ مکہ پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا، لیکن منی اور مزدلفہ کے درمیان وادی محسّر میں اس کا خاص ہاتھی محمود بیٹھ گیا، انہوں نے اسے ہر قیمت آگے بڑھانے کی کوشش کی لیکن وہ مکہ کی طرف بڑھنے کے لیے تیار نہ ہوتا، اور جب اسے مکہ سے دوسری طرف چلاتے تو دوڑتا ہوا آگے بڑھتا، اسی دوران پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اپنی چونچوں اور پنجوں میں سنگریزے لیے ہوئے آے اور انہوں نے ابرھہ کے لشکر پر سنگریزوں کی بارش برسا دی، جو کنکریاں ان کے سر سے داخل ہو کر پیٹھ سے نکلتیں، اور جسے بھی یہ کنکر لگتا اس کا جسم گلنا شروع ہو جاتا، اسے سخت کھجلی لاحق ہوتی، اور کھجاتے ہی جلد پھٹ جاتی اور گوشت جھڑنا شروع ہو جاتا، اس افراتفری میں اُن لوگوں نے یمن کی طرف بھاگنا شروع کیا، اور مشیتِ باری تعالی تھی کہ حبشی لشکر کے یہ لوگ وہیں ملیامیٹ نہ ہوئے، بلکہ مکہ سے یمن تک گرتے چلے گئے تاکہ دنیا کے لیے سامانِ عبرت بن سکیں، اور خود ابرھہ بھی یمن سے قبل قبیلہ خثعم میں جا کر ہلاک ہوا، اور بعض دوسری روایات میں ہے کہ وہ صنعاء پہنچ کر ہلاک ہوا، جبکہ اس کا جسم سکڑ کر ایک چوزے کی مانند ہو چکا تھا.

سورہ فیل کا درسِ توحید: اگرچہ اللہ تعالی نے براہِ راست اس سورت میں توحید کا بیان نہیں فرمایا، لیکن واقعہ فیل کا ذکر ہی بذاتِ خود توحید باری تعالی کا بیان ہے، کہ خانہ کعبہ اور مکہ والوں کو ابرھہ کے حملہ سے کسی دیوی دیوتا نہیں بلکہ صرف اللہ تعالی نے بچایا تھا ، یہی وجہ ہے کہ قریش اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد تک صرف اللہ ہی کی عبادت کرتے رہے تھے، چناچہ اس سورت میں قریش کو بالخصوص اور باقی لوگوں کو بالعموم دعوت دی جارہی ہے کہ محمد ﷺ جس رب کی طرف دعوت دے رہے ہیں وہ وہی اللہ وحدہ لاشریک ہے جس کی قدرت وعظمت کے نظارے تم دیکھ چکے ہو. اور اس دعوت سے روگردانی کے نتیجہ میں ان کا بھی وہی انجام ہو سکتا ہے جو اصحاب فیل کا ہوا. اور مزید یہ کہ یہ سورت اللہ تعالی کی عظیم قدرت کا مظہر ہے، جس نے اِن کمزور پرندوں سے (60) ہزار کے لشکر جرار کو تہس نہس کر دیا.

تفسیر:

(أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيْلِ) (کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟) یہ خطاب صرف نبی کریم ﷺ کو نہیں، بلکہ قریش کے علاوہ تمام لوگ بھی اس سے مخاطب ہیں، (أَلَمْ تَرَ) (کیا تم نے نہیں دیکھا) اس لیے فرمایا کیونکہ واقعہ فیل سورت کے نزول سے (۴۰-۴۵) قبل ہی پیش آیا تھا، اور اسے دیکھنے والے اکثر وبیشتر لوگ ابھی تک باحیات تھے، اور اس کے

بعد پیدا ہونیوالوں کے ہاں بھی یہ واقعہ کچھ اس طرح سے مشہو و معروف تھا کہ جیسے ان کے سامنے پیش آیا ہو. اسی لیے اصحابِ فیل کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی کہ وہ کون لوگ تھے؟اور کس غرض سے آئے تھے؟ کیونکہ یہ سب باتیں عرب کے ہاں معلوم شدہ تھیں، اور اس لحاظ سے (أَلَمْ تَرَ)کا معنی: (أَلَمْ تَعْلَمْ) (کیاآپ نے نہیں جانا؟)اور عربی لغت میں اکثر وبیشتر دیکھنے کا لفظ جاننے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے.

(أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ) (کیاان کی تدبیر کو ناکام نہ بنادیا؟) (کَیْد) کا لفظی معنی کسی خفیہ سازش کا ہے، اور ابرھہ کی خفیہ سازش خانہ کعبہ کو گرا کر عرب کواپنی طرف متوجہ کرنے کے ساتھ ساتھ تجارت کا وہ راستہ عربوں سے چھین لینا تھا جو یمن سے شام و مصر کو جاتا تھا، چنانچہ اللہ تعالی نے اُس کی سازش کو ناکام بناتے ہوئے اسے اور اس کی فوج کو تباہ وبرباد کر دیا، جبکہ خانہ کعبہ محفوظ وسلامت رہا، اور نہ صرف عرب بلکہ پوری روئے زمین کا روحانی مرکز بن گیا.

(وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْراً أَبَابِيْل) (اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیجے)، (اَبَابِیْل) کا معنی: پے در پے مختلف سمتوں سے آنے والے متفرق گروہوں کے ہیں، چنانچہ مفسرین کا فرمان ہے کہ یہ جُھنڈ کے جُھنڈ پرندے بحرہ احمر(Red sea) کی طرف آئے تھے، اس طرح کے پرندے نہ پہلے کبھی دیکھے گئے تھے اور نہ بعد میں، ہر پرندے کی چونچ اور دونوں پنجوں میں ایک کنکری تھی، جو مٹر کے چھوٹے دانے کے برابر سیاہی مائل سرخ تھیں، روایات میں آتا ہے کہ یہ کنکریاں مکہ والوں کے پاس ایک عرصہ تک محفوظ رہیں.

(تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ) (جوان پر پکی ہوئی مٹی کے کنکر پھینکتے تھے) لفظ (سِجِّیْل) فارسی کے لفظ (سنگ گِل) سے عربی میں آیا ہے، جس کا معنی: وہ پتھر ہے جو مٹی کے گارے سے بنا ہو اور پک کر سخت ہو گیا ہو، انہیں پتھروں کو سورہ الذاریات میں (حِجَارَةٌ مِنْ طِيْنٍ) یعنی (مٹی کے گارے سے بنے ہوئے پتھر) کا نام دیا گیا ہے. آیت کا معنی یہ کہ: ان پرندوں نے جو اپنے ساتھ تین تین کنکریاں لے کر آئے تھے ابرھہ کی فوج پر یہ کنکریاں برسائیں، جو کھنگری پکی ہوئی مٹی کے پتھر تھے، اور اِن کنکریوں نے کلاشن کی گولیوں سے زیادہ مہلک کردار ادا کیا.

(فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَأْكُوْل) (پھر ان کو کھائے ہوئے بھوسے کی مانند کر دیا) لفظ (عَصْفٍ) کو سمجھنے کے لیے ہم سورۃ الرحمٰن کی طرف رجوع کرتے ہیں، جہاں ارشادِ باری تعالی ہے: (وَالْحَبُّ ذُوالْعَصْفِ) (اور بھس والا اناج)، چنانچہ معلوم ہوا کہ (عَصْفٍ) اس چھلکے کا نام ہے جو دانوں کے اوپر ہو، اور صفائی کرتے ہوئے اسے دانوں سے الگ کرکے چوپائیوں کو چارے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، یعنی اللہ تعالی نے ان پرندوں سے ابرھہ کی فوج پر ایسی کنکریاں برسائیں جو ان کے سر سے داخل ہو کر پیٹھ سے نکلتیں، اور جسے بھی یہ کنکر لگتا اس کا جسم گلنا شروع ہو جاتا، اسے سخت کھجلی لاحق ہوتی، اور کھجاتے ہی جلد پھٹ جاتی اور گوشت جھڑنا شروع ہو جاتا، اور اس طرح سے ان کے اجزاء جسم اس انداز سے بکھر گئے جیسے کھائی ہوئی بھوسی ہوتی ہے.

رُكُوْعُهَا 1	104 سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ مَكِّيَّةٌ 32	اٰيَاتُهَا 9

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيْلٌ	لِّكُلِّ هُمَزَةٍ	لُّمَزَةِ ﴿1﴾
ہلاکت ہے	ہر طعنہ دینے والے کے لیے	عیب لگانے والے (کے لیے)

الَّذِیْ	جَمَعَ	مَالًا	وَّ	عَدَّدَهٗ ﴿2﴾
جس نے	جمع کیا	مال	اور	گن گن کے رکھا اسے

یَحْسَبُ	اَنَّ	مَالَهٗٓ	اَخْلَدَهٗ ﴿3﴾	كَلَّا	لَیُنْۢبَذَنَّ
وہ گمان کرتا ہے	کہ بے شک	اسکا مال	ہمیشہ زندہ رکھے گا اسے	ہرگز نہیں	البتہ ضرور وہ پھینکا جائیگا

فِی الْحُطَمَةِ ﴿4﴾	وَ	مَآ اَدْرٰىكَ	مَا الْحُطَمَةُ ﴿5﴾
حطمہ میں	اور	آپ کیا جانیں	حطمہ کیا ہے

نَارُ اللّٰهِ	الْمُوْقَدَةُ ﴿6﴾	الَّتِیْ	تَطَّلِعُ	عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ﴿7﴾
اللہ کی آگ ہے	بھڑکائی ہوئی	جو	پہنچے گی	دلوں پر

اِنَّهَا	عَلَیْهِمْ	مُّؤْصَدَةٌ ﴿8﴾	فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ﴿9﴾
بے شک وہ	ان پر	بند کردی جائے گی (ہر طرف سے)	لمبے لمبے ستونوں میں

نام: سورت کی پہلی آیت میں لفظ (ہُمَزَۃ) سے لیا گیا ہے.

زمانہ نزول: اس سورت کے مکی ہونے پر تمام مفسرین کا اتفاق ہے، جبکہ اس کا مضمون بھی اسی بات پر دلالت کرتا ہے، جس میں آخرت کے منکرین اور ان کے انجام کا بیان ہے.

موضوع ومضمون: اس سورت میں چند اخلاقی برائیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو جاہلیت سے چلی آرہی ہیں، اور وہ ہے مادہ پرستی اور اس کے دین، اخلاق اور معاشرت پر برے اثرات، جب مال ودولت کے نشہ میں انسان انسانیت کو فراموش کے فرعونیت اختیار کر لیتا ہے، دوسروں کو حقیر جانتا ہے، مال سمیٹ سمیٹ کرر کھتا اور اسی مال ہی کو اپنی بقاء اور عزت و قار کا سبب گردانتا ہے، چنانچہ اس سورت میں اس گھناؤنی اور رذیلہ حصلت کا انجام بیان فرمایا کہ ایسے لوگ کس انجام سے دوچار ہونے والے ہیں.

تفسیر:

(وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ) (تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو عیب ٹٹولنے والا غیبت کرنے والا ہے) (وَیْلٌ) کا لفظ تباہی افسوس اور خرابی کے معانی میں آتا ہے، (ہَمْزٍ) اور (لَمْزٍ) بعض علماء کے ہاں ایک ہی معنی میں ہیں، اور بعض دوسرے مفسرین کے ہاں (ہَمْزٍ) وہ شخص جو رُو برُو برائی کرے، اور (لَمْز) وہ جو پیٹھ پیچھے غیبت کرے۔ اور بعض علماء نے (ہَمْز) کا معنی آنکھوں اور ہاتھوں کے اشارہ سے برائی کرنا، اور (لَمْز) کا معنی زبان سے برائی کرنا لیا ہے. معنی یہ کہ لوگوں کو حقیر سمجھ کر انہیں طعنے دینے، عیب نکالنے، اور غیبت کرنے والوں کو تباہی وبربادی کی وعید ہے

(اَلَّذِيْ جَمَعَ مَالاً وَّعَدَّدَهُ) (جو مال کو جمع کرتا اور گن گن کے رکھتا ہے) یہ آیت پہلی آیت میں مذکور شخص کے تکبر و غرور کا سبب بیان کر رہی ہے کہ دوسروں کی تحقیر وتذلیل کرنے والے کا گھمنڈ اس کے مال ودولت کی وجہ سے ہے، جو مال جمع کرتا اور اسے گن گن کر رکھتا ہے، جو اس کے بخل و کنجوسی اور زر پرستی کی دلیل ہے، اور یہ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ مالداروں اور زر پرستوں کو مال جمع کرنے اور اسے گن گن کر رکھنے میں ایک خاص لذت محسوس ہوتی ہے.

(يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ) (وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس ہمیشہ رہے گا)، مادہ پرستی میں یہ شخص اس قدر منہمک ہو چکا ہے کہ اسے اپنی موت بھی یاد نہیں رہی، بلکہ سمجھتا ہے کہ یہ مال اس کے پاس ہمیشہ کے لیے ہے، اور وہ خود بھی ہمیشہ رہنے والا ہے، ضروری نہیں کہ وہ ایسی باتیں زبان سے کرتا ہو، لیکن کسی شخص کی مال سے اس قدر محبت اور مادہ پرستی میں اس قدر آگے بڑھ جانا کہ اسے آخرت بھول جائے اور اس کے لیے کوئی تیاری نہ ہو اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے ہاں دنیا سے جانے کا کوئی تصور نہیں ہے.

(كَلاَّ لَيُنْبَذَنَّ فِيْ الْحُطَمَةِ) (ہر گز نہیں، وہ تو ضرور چکنا چور کر دینے والی میں پھینکا جائے گا) (كَلَّا) یعنی بات ایسی نہیں جو وہ تصور کیے ہوئے ہے، اور (نبذ) کے معنی کسی چیز کو ردی اور بے کار سمجھتے ہوئے پھینک دینا، یا کسی چیز کی پروانہ کرتے ہوئے اسے پسِ پشت ڈال دینا، لفظ (الْحُطَمَةِ) (حطم) سے ہے، جس کے معنی توڑ پھوڑ اور ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ہے، جہنم کی یہ صفت اس لیے ہے کہ اس میں پڑنے والی ہر چیز جہنم کی شدت کی وجہ سے چکنا چور ہو جانے والی ہے، جیسا کہ صحیحین میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: (میں نے جہنم کو دیکھا جس کے بعض حصے دوسرے حصوں کو تہس نہس کر رہے تھے)، مطلب یہ ہے کہ ان مادہ پرست لوگوں کو نہایت حقیر وذلیل حالت میں جہنم میں پھینک دیا جائے گا.

(وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ) (اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ چکنا چور کرنے والی کیا ہے؟) یہ سوال جہنم کی ہولناکی کے بیان کے لیے ہے، یعنی وہ اتنی ہولناک ہے کہ جس کا تمہاری عقل ادراک نہیں کر سکتیں، اور اس کی سختی تمہارے وہم وگمان میں بھی نہیں ہے.

(نَارُ اللهِ الْمُوْقَدَةُ) (وہ اللہ تعالی کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے)، قرآنِ کریم میں یہی ایک مقام ہے جہاں جہنم کی آگ کو اللہ تعالی کی طرف منسوب کیا گیا ہے، کہ اللہ تعالی نے یہ آگ بھڑکائی ہے، جس سے آگ کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے، کہ جس آگ کو رب ذوالجلال، عزیز ذوانتقام نے بھڑکایا ہو وہ کیسی المناک، ہولناک آگ ہوگی، بلکہ مزید یہ کہ ان الفاظ میں مادہ پرست مغرور ومتکبر پر اللہ تعالی کے غیض وغضب کا اظہار ہوتا ہے. جو کسی انسان کو خوابِ غفلت سے جگانے کے لیے کافی ہے.

(اَلَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الأَفْئِدَةِ) (جو دلوں پر چڑھتی چلی جائے گی) (فؤاد) دل کا وہ حصہ ہے جو انسان کے شعور وادراک، اور جذبات وخواہشات ، اور جذبات کی شدت وتاثیر سے تعلق رکھتا ہے، مطلب یہ کہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی یہ آگ دل کے اس حصہ تک پہنچے گی جو جذبات کا مرکز ہے، ایسا دل جو زر پرستی اور مال کی محبت سے معمور ہے، جو دوسروں کو حقیر وذلیل اور اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے، یہ آگ اس کے ان جذبات اور دل کے اس حصے کو بھون کر رکھ دیے گی جو برے خیالات، فاسد عقائد اور ناپاک عزائم کا مرکز تھا.

(إِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ) (اور ان پر ہر طرف سے بند کر دی جائے گی) (فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ) (اونچے اونچے ستونوں میں (گھرے) ہوں گے)، یعنی ایسے مغرور ومتکبر، مادہ پرست لوگوں کو ذلیل وحقیر سمجھ کر جہنم میں پھینکنے کے بعد انہیں لمبے ستونوں میں بند کر دیا جائے گا، جہاں ان کے لیے کوئی دروازہ کھڑکی تو درکنار کوئی سوراخ بھی نہیں ہوگا، اور جہاں ان کا کوئی پرسانِ حال نہ ہوگا. اور یہ جہنم کی آگ کے علاوہ مزید اذیت ناک عذاب ہے. (اَللّٰهُمَّ أَجِرْنَا مِنَ النَّارِ) اللہ ہمیں آگ کے عذاب سے پناہ دے.

سورۃ الہمزۃ کا پیغام:

یہ سورت آج کے مادہ پرستوں اور مال وزر کی ہوس رکھنے والوں کے لیے لمحہ فکر ہے، جو مال کی محبت میں اس قدر اندھے ہو چکے ہیں کہ وہ مقصد ہی فراموش کر چکے ہیں جس کے لیے پیدا ہوئے ہیں، اگر مالدار ہیں تو اپنے بنک بیلنس بڑھانے کی کوشش اور اس کے حساب وشمار میں مست ہیں، اور اگر تنگدست ہے تو ہر لمحہ مال حاصل کرنے کی کوشش، جسے سوتے جاگتے صرف اپنے معاش کی فکر ہے، بے نماز کو تو اپنے دین کیا فکر ہو گی؟ حتی کہ نماز روزے کا اہتمام کرنے والے اکثر وبیشتر لوگ بھی اپنی عبادات کے پیچھے دنیا ہی کی طلب کرتے نظر آتے ہیں، حالانکہ قرآن نے جابجا مال کے فتنہ سے بچنے کی تعلیم دی ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالی ہے: (إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ) (تمہارے مال واولاد تو محض آزمائش ہیں)، صحیح بخاری میں نبی کریم ﷺ نے مال ودولت کی ہوس رکھنے والے کو درہم ودینار کا بندہ قرار دیتے ہوئے اس کے لیے بد دعاء کی ہے، اور پھر رحمت للعالمین کی بد دعائیں لینے والے کیسے ممکن ہے کہ خوشی ومسرت اور سعادت کی زندگی بسر کر سکیں؟؟؟

تفسیر سورۃ العصر Surat Al-` Asr

ایاتہا 3 — 103 سُوْرَةُ الْعَصْرِ مَكِّيَّةٌ 13 — رکوعہا 1

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَ	الْعَصْرِ (1)	اِنَّ	الْاِنْسَانَ	لَفِيْ خُسْرٍ (2)
قسم ہے	زمانے کی	بے شک	انسان	یقیناً خسارے میں ہے

اِلَّا	الَّذِيْنَ	اٰمَنُوْا	وَ	عَمِلُوا	الصّٰلِحٰتِ
سوائے	ان لوگوں کے جو	سب ایمان لائے	اور	ان سب نے اعمال کیے	نیک

وَ	تَوَاصَوْا	بِالْحَقِّ	وَ	تَوَاصَوْا	بِالصَّبْرِ (3)
اور	ایک دوسرے کو وصیت کی ان سب نے	حق بات کی	اور	ایک دوسرے کو وصیت کی ان سب نے	صبر کی

وجہ ء تسمیہ: اس کا نام پہلی آیت کے لفظ (عصر) سے لیا گیا ہے.

زمانہ نزول : بعض تابعین نے اسے مدنی قرار دیا ہے، لیکن جمہور مفسرین اسکے مکی ہونے کے قائل ہیں.

موضوع ومضمون : یہ سورت جامع اور مختصر کلام کا بے نظیر نمونہ ہے. جس میں چند جچے تلے الفاظ میں معنی کی ایک دنیا بھر دی گئی ہے. انسان کی فلاح وکامیابی کا راستہ اور اسکی تباہی وبربادی کا راستہ بتا دیا گیا ہے. اس کے مضمون کی اہمیت کے پیشِ نظر اصحاب رسول ﷺ ایک دوسرے سے ملتے تو اس وقت تک جدا نہ ہوتے جب تک ایک دوسرے کو سورۃ العصر نہ سنا لیتے (طبرانی)، اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں: اگر لوگ اس سورت پر غور وفکر کرلیں تو ان کے لیے کافی ہو.

تفسیر :

(وَالعَصْرِ) (و) قسم کے لیے، اور عربی لغت میں حرف (و) کے متعدد استعمالات میں اسے قسم کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے. قسم کے تعلق سے: قسم کھانے کا مقصد کسی چیز کی حقیقت بیان کرنا، یا اسے ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے. لفظِ قسم کے بعد کا جملہ عموماً جوابِ قسم ہوتا ہے.

مزید یہ کہ اللہ تعالی اپنی مخلوقات میں سے جس کی چاہے قسم کھا سکتا ہے، لیکن انسانوں کے لیے اللہ کی قسم کے علاوہ کسی چیز کی قسم کھانا جائز نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: (مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللهِ فَقَدْ أَشْرَكَ) (جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے شرک کیا.

عصر سے مراد: زمانہ جیسے کہ ابن عباس نے تفسیر فرمائی ہے. اور بعض دوسرے مفسرین نے اس سے مراد نمازِ عصر لی ہے، جس کی تاکید کرتے ہوئے اللہ تعالی نے فرمایا: (حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلاَةِ الْوُسْطَى) (نمازوں کی حفاظت کرو، اور خصوصاً درمیانی نماز (عصر) کی.

لفظِ زمانہ: زمانے کی تین اقسام ہیں: ماضی، حاضر اور مستقبل، یہاں ماضی وحاضر دونوں طرح کے زمانے مراد ہیں، زمانہ حاضر سے مراد شب روز کی یہ گردش ہے جو اللہ تعالی کی قدرت اور اس کی تدبیر عالَم کی دلیل ہے.

گذرے ہوے زمانے کی قسم سے مراد یہ کہ انسانی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ صفات نہ اپنائیں وہ بالآخر خسارے میں پڑ گئے، جیسا کہ قرآن کریم سابقہ قوموں کی تباہی و بربادی کی داستانیں بیان کرتا ہے. اور گذرتے ہوے زمانے کی قسم سے مراد یہ کہ گذرتا ہوا وقت کسی بھی شخص کے لیے دنیا میں عبادت کرنے کے لیے دیا گیا ہے، جیسے کہ طالب علم کو کمرہ امتحان (Examination hall) میں پیپر حل کرنے کا وقت ملا ہو، جس کا ہر لمحہ اس کے لیے بہت قیمتی ہے. اگر وہ یہ وقت ضائع کر دیتا ہے تو نتیجتاً امتحان میں فیل ہو جاتا ہے، اسی طرح اللہ کی عبادت نہ کرتا، اور شب و روز دنیا کی مستیوں اور مادہ پرستی میں گذار دینا، بہت بڑا خسارہ ہے.

(إِنَّ الإِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ) یہ جوابِ قسم ہے. لفظِ انسان اسمِ جنس کے طور پر استعمال کیا گیا ہے. جس سے مراد پوری نوعِ انسانیت ہے. خسارے کا لفظ: نفع کے ضد ہے. جس سے مراد کسی ایک چیز میں نقصان ہوتا ہے. اور کاروبار مکمل طور پر تباہ ہو جانا بھی ہے. قرآن کریم میں اسے فلاح کے مقابلے میں استعمال کیا گیا ہے. جس میں دنیا و آخرت کی فلاح شامل ہے. اور یہاں خسارے سے مراد بھی دنیا و آخرت دونوں کا خسارہ ہے، فخر الدین رازی نے کسی بزرگ کا قول نقل کیا کہ میں نے سورہ العصر کا مطلب ایک برف فروش سے سمجھا جو بازار میں آواز لگا رہا تھا کہ اس شخص پر رحم کرو جس کا سرمایا گھلا جا رہا ہے. اور وہ اس طرح کہ زندگی قیمتی ترین سرمایا ہے، ہر گذرنے والا لمحہ اسے ختم کر رہا ہے، اور ہر قدم انسان کو قبر کے قریب کر رہا ہے، چنانچہ اگر وہ اِن لمحات کو زندگی کے مقصد (صرف ایک اللہ کی عبادت) پر صَرف نہیں کرتا تو اس جہنم کی طرف جا رہا ہے جس کا وہ ہمیشہ ہمیش کے لیے ایندھن بننے والا ہے، ساتھ ہی نعمتوں بھری جنت سے محروم ہو رہا ہے جس سے بڑھ کر کوئی خسارہ و نقصان نہیں ہو سکتا. إرشادِ باری تعالی ہے: (قُلْ إِنَّ الْخَاسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْا أَنْفُسَهُمْ وَأَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَلاَ ذَلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْن) (کہہ دیجیے: حقیقی نقصان پانے والے وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو اور اپنے اہل کو قیامت کے دن کھو بیٹھیں گے، یاد رہے کہ یہی کھلم کھلا نقصان ہے).

(إِلاَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا) یعنی سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے، ان کی زندگی چاہے جیسی بھی گزری ہو، لیکن موت کے بعد وہ جنت کی ابدی اور پُر آسائش نعمتوں سے بہرہ ور ہوں گے.

لفظِ إیمان: سچے دل سے ماننے اور یقین کرنے کے ہیں، جس میں زبان سے اقرار اور دل کا یقین اور پھر اسے عملی جامہ پہنانا ہے، نہ کہ صرف زبانی اقرار. اللہ رب العزت نے ایمان کی حقیقت اِن الفاظ سے بیان فرمائی: (إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِاللهِ وَرَسُوْلِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُوْنَ) (مومن تو صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر (دل سے) یقین لائے، پھر انہیں (ایمان کی باتوں میں کسی طرح کا) شک نہیں رہا، اور انہوں نے اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، ایسے ہی لوگ سچے ایمان دار ہیں.

جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے: (1) اللہ تعالی پر. (2) رسولوں پر. (3) فرشتوں پر. (4) آسمانی کتابوں پر. (5) آخرت کے دن اور (6) اچھی بری تقدیر پر. یہ ایمان اخلاق اور سیرت و کردار کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے جس پر ایک پاکیزہ زندگی قائم ہو سکتی ہے، جس میں انسان بلا خوف و خطر اپنی زندگی کے شب و روز گذارتا ہے. اور اس ایمان کے بغیر زندگی کتنی بھی خوشنما کیوں نہ ہو اس کا حال اس بے لنگر جہاز کا سا ہے جو کہیں قرار نہ پکڑ سکتا ہو.

(وَعَمِلُوْا الصَّالِحَات) (الصالحات) کا لفظ تمام نیکیوں کا جامع ہے. لیکن قرآن وسنت کی اصطلاح میں کوئی عمل صالح نہیں ہوتا جب تک اس میں تین شرطیں نہ ہوں: (۱) عمل اللہ تعالی کے لیے خالص ہو. (۲) اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے دیے ہوے طریقے پر ہو. (۳) عمل کرنے والا مومن ہو، چنانچہ ایمان وہی معتبر اور مفید ہے جس کے صادق ہونے کا ثبوت انسان اپنے عمل سے پیش کرے. ایمان و عمل کا تعلق بیج اور درخت کا ہے. بیج کے بغیر درخت پیدا نہیں ہو سکتا. اور اگر بیج زمین میں ہے اور درخت نہیں تو بیج کے بیکار ہونے کی دلیل ہے.

(وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ) حق کی وصیت میں پوری شریعت ہے جس میں سبھی اصول وفروع (دین کے چھوٹے بڑے مسائل) شامل ہیں. معنی یہ ہیں کہ ایمان لانے والوں کو فرد فرد بن کر نہیں رہنا، بلکہ ان کے اجتماع سے ایک مومن وصالح معاشرہ وجود میں آنا چاہیے. اور معاشرے کو بگاڑ سے بچانے کے لیے ہر فرد دوسرے کو حق بات کی تلقین کرے. اور جو لوگ خود تو حق پر قائم ہوں لیکن معاشرے میں حق کو پامال ہوتے دیکھتے رہیں تو وہ لوگ خسارے سے نہیں بچ سکتے. اللہ تعالی نے بنی إسرائیل کے تین گروہوں کا ذکر کیا: (۱) گناہ گار. (۲) گناہ سے بچنے والے لیکن گناہ گاروں کو منع نہ کرنے والے (۳) گناہ سے بچ کر دوسروں کو بھی بچنے کا حکم دینے والے، تو عذابِ إلہی آنے پر صرف تیسرے گروہ کو عذاب سے بچایا (فَأَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْءِ وَأَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَئِيْسٍ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْن) (پس ہم نے گناہ سے منع کرنے والوں کو بچالیا، اور ظلم (گناہ) کرنے والوں کو ان کے کرتوتوں کی وجہ سے بدترین عذاب میں مبتلا کر دیا.

لفظِ (حق) سے مراد: صراطِ مستقیم، صحیح سچی اور مطابق عدل وانصاف بات، خواہ وہ عقیدہ وایمان سے تعلق رکھتی ہو یا دنیاوی معاملات سے.

(وَتَوْاصَوْا بِالصَّبْرِ) صبر کی تلقین کی مناسبت یہ ہے کہ مذکورہ تینوں عمل صبر کے بغیر ممکن نہیں ہیں. ایمانِ لانے والوں کو آزمائشوں وامتحانات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالی ہے: (الم . أَحِسبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوْا أَنْ يَقُوْلُوْا آمَنَّا وَهُمْ لاَ يُفْتَنُوْنَ. وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِيْنَ) (کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ انہیں صرف ایمان کے دعوے پر ہی بغیر آزمائش کے چھوڑ دیا جائے گا، ان سے پہلے لوگوں کو بھی ہم نے خوب آزمایا، چنانچہ اللہ تعالی سچوں اور جھوٹوں کو ضرور ظاہر کرے گا)، اور ایمان کے بعد عمل صالح کے لیے صبر کی ضرورت ہے، جس صبر کے ساتھ آدمی نیکی کے اعمال پر استقامت اختیار کر سکتا ہے، ورنہ وہ جلد ہی انہیں چھوڑ بیٹھتا ہے. اور تیسرا عمل: اس ایمان و عمل کی دعوت دینا ہے۔ جس کے لیے تو صبر جمیل کی اشد ضرورت ہے، صبر کا اجر وثواب: (إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِحِسَابٍ) (صبر کرنے والوں کو (آخرت میں) بغیر حساب اجر دیا جائے گا.

صبر کی تین اقسام: (۱) نیکی پر صبر. (۲) برائی سے بچنے کے لیے صبر. (۳) اللہ کی طرف سے مقدر آلام وآفات پر صبر.